تساؤلات جدلية حول الإسلام وتعليقات

(باللغة الأردوية)

تأليف

الدكتور سعيد إسماعيل صيني

اسلام پر اعتراضات

اور ان کے جوابات

تالیف

ڈاکٹر سعید اسماعیل صینی

نظر ثانی

ارشد بیگ (ابو سلطان)

ناشر

دار الکتاب والسنہ

ح سعيد إسماعيل صيني، ١٤٣٤هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

صيني، سعيد إسماعيل

تساؤلات جدلية حول الإسلام وتعليقات./ النص باللغة الأردوية./ سعيد إسماعيل صيني.- المدينة المنورة، ١٤٣٤هـ

١٦٨ ص؛ ١٤×٢١ سم

ردمك:

١ـ الإسلام ـ أسئلة وأجوبة ٢ـ الإسلام ـ دفع مطاعن أ- العنوان

ديوي ٢٥٢

رقم الإيداع:

ردمك:

الطبعة الأولى ١٤٣٤هـ

منقحة ومزيدة

توزيع: دار الفالحين للطباعة والترجمة والنشر والتوزيع

الرياض - جوال: ٠٥٨٠٤٤٦٦٨٨ هاتف: ٤٣٥٦٦٨٨ ناسوخ: ٤٣٥٨٨٦٦

E-Mail: alfalheen@gmail.com

كِتَـــابُ اللهِ عَـــزَّ وَجَـــلَّ قَـــولِي وَمَـــا صَـــحَّتْ بِـــهِ الآثَـــارُ دِيْنِـــي

فَـــدَعْ مَـــا صَـــدَّ عَـــن هـــذي وَخُـــذْهَا تَكُـــنْ مِنهَـــا عَلَـــى عَـــيْنِ الـــيَقِينِ

دار الكتـــاب والسنـــة للنشـــر الـــدولي

DAR AL-KITAB WA AL-SUNNA

INTERNATIONAL PUBLISHING HOUSE

4 - Shesh Mahal Road, Lahore: 54000 Pakistan, Tel. +92 3335666966

P. O. Box: 330110 Riyadh: 11373 Kingdom of Saudi Arabia

Mobile: +966 555 281537 Tel.: +966 1 435 6688 Fax: +966 1 435 7322

www.darkitab.com E-mail: info@darkitab.com – darkitab@gmail.com

فہرست مضامین

❀ مقدمہ طبع پنجم ---------- 7

فصل اوّل:......اسلام عقیدہ وعبادات اور شریعت کا نام ہے

❀ اسلام کے بنیادی عقائد وعبادات کیا ہیں؟---------- 13

❀ چودہ صدیاں قبل کی شریعت کی تطبیق کیونکر ممکن ہے؟---------- 15

❀ اگر یہ سوال ایک مسلمان کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟---------- 16

❀ شریعتِ اسلامی کا حالات وواقعات سے ربط وتعلق کی نوعیت ---------- 19

❀ شریعتِ اسلامی کی دائمی وابدی اہم خصوصیات ---------- 22

۱۔قرآن کریم ---------- 24

۲۔سنت نبویہ (علی صاحبہا الف الف صلاۃ وسلام)---------- 25

۳۔اجتہاد ---------- 25

۴۔اجماع ---------- 29

فصل دوم:......قضاء وقدر، جہاد اور اللہ کے لیے دوستی اور دشمنی

فصل سوم:......خیر پھیلانے کی حرص

❀ مسلمان اسلام کیوں پھیلانا چاہتے ہیں؟ ---------------------------------- 59

❀ دوسرے ادیان کی سرگرمیوں کی بابت اسلام کا موقف کیا ہے؟ ---------------- 62

❀ اسلام کا مملکت میں دیگر مذاہب کی اعلانیہ سرگرمیوں کی بابت کیا موقف ہے؟---- 65

فصل چہارم:......اسلام میں انسانی حقوق کا مفہوم

❀ اسلام میں عدل ومساوات کا مفہوم کیا ہے؟ -------------------------------- 71

❀ اسلام میں آزادی کا مفہوم کیا ہے؟ ------------------------------------ 73

❀ شہری آزادی سے کیا مراد ہے؟ --------------------------------------- 76

❀ اسلام میں غلامی سے کیا مراد ہے؟ ----------------------------------- 78

❀ سیاسی تنظیم واتحاد سے متعلق اسلام کا موقف کیا ہے؟ ---------------------- 80

❀ وطنیت اور تعددِ مذاہب کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟---------------- 86

❀ انسانی تعلقات کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ ---------------------- 88

❀ مکالمات بین المذاہب کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ --------------- 92

❀ انسانی حقوق سے متعلقہ تنظیموں کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ --------- 93

فصل پنجم:......اسلام میں عورت کا مقام

❀ عورت کا مرد کے مقابلہ میں کیا مرتبہ ومقام ہے؟ -------------------------- 98

❀ سیاسی سرگرمیوں میں عورت کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ ---------------------- 105
❀ بعض معاملات میں عورت کی گواہی مرد کے مقابلہ میں آدھی کیوں ہے؟ ------ 107
❀ عورت بعض حالات میں مرد سے آدھی میراث کی مستحق کیوں ہوتی ہے؟------ 109
❀ اسلام میں عورت کے نکاح اور طلاق کا ضابطہ کیا ہے؟-------------------- 113
❀ ایک مسلمان عورت غیر مسلم سے شادی کیوں نہیں کرسکتی ؟ ----------------- 115
❀ اسلام میں تعددِ ازواج کی اجازت کیوں ؟ ---------------------------- 118
❀ عورت کو گاڑی چلانے کی اجازت کیوں نہیں؟---------------------------- 121
❀ عورت کے لیے پردہ کیوں ضروری ہے؟ -------------------------------- 122

فصل ششم:......اسلام دہشت گردی اور تشدد و زیادتی کا مخالف ہے

❀ جائز دفاعی تیاری (ارعاب) اور ظالمانہ دہشت کے مابین کس طرح فرق کیا جائے؟ 130
❀ اسلام میں ظالمانہ دہشت گردی کا علاج کیا ہے؟------------------------- 133
❀ کیا قرآن کریم کے مدارس بغض وحسد اور انتہا پسندی پیدا کرتے ہیں؟ ------- 135

فصل ہفتم:......انتہا پسندی اور شریعتِ اسلامی کی تطبیق

❀ بعض اسلامی حکومتوں کے کاموں کو کیوں انتہا پسندی کا لقب دیا جاتا ہے؟ ----- 143
❀ ایک اسلامی حکومت سزائے موت کے قانون کو کیوں نافذ کرتی ہے؟ --------- 144
❀ اسلام نے چور کی سزا ہاتھ کاٹنا کیوں مقرر کی ہے؟------------------------ 147
❀ اسلام نے زانی کی سزا کوڑے کیوں مقرر کی ہے؟ ------------------------ 149
❀ شادی شدہ مرد یا عورت کی رجم وسنگ ساری کی سزا میں کیا حکمت ہے؟ ------ 151

❀ کیا وہ شخص جو دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے قتل کا مستحق ہوگا؟ ------------ 154
❀ ایک اہم نکتہ -- 157
❀ خلاصہ -- 160

مقدمہ طبع پنجم

سب تعریفیں اللہ رب العالمین کو سزا وار ہیں اور صلوٰۃ وسلام ہو حضرت رسالت مآب خاتم النبیّن محمد مصطفیٰ ﷺ پر اور سب انبیاء ومرسلین پر جن کو رب تعالیٰ نے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور رب تعالیٰ راضی ہو۔ نبی کریم کے بابرکت صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور سب پیغمبروں کے حواریوں سے، اور قیامت تک آنے والے ان لوگوں سے (بھی) جنھوں نے صفت احسان کے ساتھ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کی۔

اما بعد!

دورِ حاضر میں پھیلی ایک سنگین غلطی یہ ہے کہ ربانی تشریعات کو ان عقلی صلاحیتوں کے ساتھ پرکھا اور جانچا جاتا ہے جو کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنے میں اور اس کی ماہیت کا استعیاب کرنے میں نہایت محدود وسائل کی مالک ہیں۔ چنانچہ انسان کے سونگھنے، دیکھنے اور سننے کے حواس جدید ترین وسائل کی مدد کے باوجود متعدد ایسی اشیاء کے ادراک سے عاجز و قاصر ہیں جن میں ہم روزانہ جی رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اشیاء کے ادراک اور ان کی حقیقت کی معرفت کے دو طریقے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہم دو طریق کا اعتماد ان لوگوں کی سچائی پر ہوتا ہے جو ہم تک ایک مخصوص معرفت کو نقل کرتے ہیں چاہے وہ ناقل فردِ واحد ہو یا ایک سے زیادہ اور چاہے یہ ناقلین افراد کا ایک سلسلہ ہوں یا جماعات کا سلسلہ ہوں۔ اشیاء کے ادراک کا دوسرا طریق عقلی کہلاتا ہے۔ بنیادی طور پر اس طریق کا انحصار اس معرفت و ادراک پر ہوتا ہے جس کا ہمارے حواس خمسہ ادراک کرتے ہیں اور جس تک ہماری استنباطی صلاحیتیں اس معرفت پر اطلاع پانے کے بعد پہنچاتی ہیں۔

اور جب کسی بات کا تعلق بالخصوص ان معلومات کے ساتھ ہو جن کی نسبت براہِ راست رب تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے ہو جیسے آسمانی کتب وغیرہ تو وہ دوسری فصل جسے حضرات انبیائے کرام عَلَیہِ السَّلام کے بابرکت دور میں زندگی گزارنے کا موقعہ نہ ملا ہوا سے معرفت حقائق اور ادراک کے لیے نقلی طریق دلائل کو جب کہ وہ دلائل وافر تعداد میں موجود بھی ہوں، ترجیح دینے کے سوا دوسرا کوئی رستہ نہیں۔ عقلی طریق کے دلائل کا درجہ اس کے بعد کا ہے۔ اوراس کی وجہ یہ ہ یکہ جب ہم علم کی تدریجی ترقی کی تاریخ کا قرار واقعی جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ انسان ازل سے متعدد موجود طبعی اشیاء کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے اور اگر سمجھ بھی پایا ہے تو صدیوں کی طول طویل تدریجی ان تھک اور جاں گسل کاوشوں کے بعد۔ اور اب بھی رب تعالیٰ کی پیدا کردہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے لیے آج تک غامض، پیچیدہ اور مغلق ہیں اور انسانی محدود عقل وفہم ان کی معرفت حاصل کرنے، اس کے سمجھنے اور اس کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز و لاچار ہے۔ اکثر علمی دریافتیں شکوک و شبہات اور حیرت و استغراب پیدا کرتی ہیں لیکن ہم ان دریافتوں کو محض اس لیے مان لیتے ہیں کیونکہ جن وسائل و ذرائع سے ہم تک وہ دریافتیں پہنچی ہیں ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں جیسے علمی مراکز، ماہر علماء یعنی ہم ان دریافتوں کو اس لیے قبول نہیں کرتے کہ عادی عقلی دلائل ان دریافتوں کو ثابت کرتے ہیں بلکہ ہم ان دریافتوں کو محض اس لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ دلائل نقلیہ ان کو ثابت کرتے ہیں۔

اوراس سے بھی فاش غلطی یہ ہے کہ انسان کائنات کے اس عظیم، شامل و کامل اور حیرت انگیز نظام کے کسی ایک جزء کا علمی احاطہ کر لیتا ہے اور اس پر اس کی شوخی اور بے باکی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنی محدود معلومات اور محدود و عقلی استعدادوں کے سہارے اس چھوٹے سے جزئیہ کو مدار اور کسوٹی بنانے کی جرأت بے جا کرنے لگتا ہے حالانکہ ابھی تک اسے اس وسیع نظام کے جملہ حقائق تک رسائی و آگاہی حاصل بھی نہیں ہوئی اور اس غلطی کی سنگینی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ نصوص مقدس ہوں اور ان کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہو اور وہ

نصوص قطعی طور پر یا اس کے قریب قریب ثابت ہوں۔اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ایک محقق امورِ حیات سے متعلقہ بعض اسلامی تشریعات میں بحثا بحثی تو شروع کر دے لیکن اس بات میں مطلق غور نہ کرے کہ ان تشریعات کا بعض دوسرے معاملات سے متعلقہ تشریعات کے ساتھ بھی تعلق ہے؟ اور جو شخص تشریع کے بعض اجزاء میں ان کے طبعی سیاق سے غفلت و جہالت برتتے ہوئے بحثا بحثی شروع کر دے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی کامل اور متناسق نظام کے کسی ایک جزء کو پورا نظام سمجھ بیٹھے اور اس نظام کے باقی ان اجزاء سے تجاہل برتے جو اس نظام کو کامل و مکمل کرتے ہوں جیسے مثلاً وہ شخص یوں کہے کہ بھلا اس تیرہ و تاریک رات کا کیا فائدہ جس سے سوائے ڈر اور خوف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہمیں اس کا اندھیرا دُور کرنے اور اس میں روشنی کرنے کے لیے کافی خرچ کرنا پڑتا ہے اور اس بات کی طرف اس کا دھیان بھی نہ ہو کہ اگر رات اور اس کی تاریکی نہ ہوتی تو نہ دن کی معرفت حاصل ہوتی اور نہ اس کی روشنی کی اور نہ ان دونوں کی قدر و قیمت کا احساس ہی ہو پاتا۔

بسا اوقات نصوص کو ان کے اصل سیاق و سباق سے جدا کر کے ان نصوص پر بعض مدلولات کے اطلاق کی خطا کا سبب جہل نہیں ہوتا بلکہ اس خطا کا سبب غفلت، لا پرواہی اور سستی اور محدود رائے کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ایسی خطا کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک محقق بعض آسمانی تشریعات میں بحث کرے اور ان میں فقط دنیاوی تناظر میں بحث کرے۔ یا اس تشریع اسلامی میں اس زاویہ نگاہ سے بحث کرے کہ وہ عارضی اور ناپائیدار دنیا اور ہمیشہ ہمیشہ کی آخرت کے درمیان تعلق سے بالکل صرف نظر کر لے اور غفلت کا ارتکاب کرے اور یہ بات بھول جائے کہ اس دنیا کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ آخرت کھیتی ہے۔ آج جو اس میں بوئیں گے وہی کل وہاں آخرت میں کاٹیں گے۔ اور ہم دنیا میں جو کچھ بوتے ہیں اس کا اس دنیا میں بہت معمولی حصہ کاٹتے ہیں، اعتبار تو اس کا ہے جو ہم آخرت میں کاٹیں گے۔

ان غلطیوں کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ یہ محققین ایسے ایسے مدلولات لاتے ہیں جو صحیح مقصود کے سراسر مخالف و متعارض ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ عقل مند جب بھی نصوصِ مقدسہ کی

کسی جزئیہ پر نقد وتبصرہ کرتا ہے یا اس کی اصلاح کا اقدام کرتا ہے تو وہ کسی قسم کی مدح یا جرح وقدح کرنے سے پہلے سب سے پہلے اس بات کی معرفت حاصل کرتا ہے کہ اس جزئیہ یا بعض اجزاء کا پورے نظام میں کیا عمل دخل ہے۔

اس نامسعود میں جا بجا پھیلی ایک اور خطا یہ ہے کہ ایک آدمی اسلام کی نصوصِ مقدسہ کو دیکھنے کی بجائے مسلمانوں کے حال اور ان کے اعمال کو دیکھ کر اسلام پر حکم لگانے بیٹھ جاتا ہے، حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام یا کسی بھی دین میں اور اس دین کی طرف منسوب لوگوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ چاہے وہ لوگ محض نام کے دیندار ہوں یا سچے دیندار ہوں یا اس دین کی بابت بے حد شدت پسند ہوں۔ دین اسلام پر گفتگو کرنے والے مصنفین عموماً اسلام کے قضایا کلیہ کی یا تو از حد اختصار کے ساتھ تعریف بیان کرتے ہیں یا پھر منطقی اسلوب اپناتے ہوئے لا طائل طوالت اختیار کرتے ہیں۔ ان مصنفین کا یہ طرزِ عقیدہ، عبادات، تشریعات، دعوت، انسانی حقوق، عورتوں کے حقوق، دہشت گردی، انتہا پسندی اور شدت پسندی سے متعلق ان سوالات کے جوابات دیتے وقت ہوتا ہے جو زبانِ زد خلائق ہوتے ہیں۔

مؤلف نے یہ کتاب لکھتے وقت ان اعتراضات وسوالات کو اہتمام سے ذکر کیا ہے جو مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں میں کثرت کے ساتھ گردش کرتے رہتے ہیں اور اپنے پرائے سب کی زبانوں پر ان کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرے مؤلف ان سوالات کے جوابات دینے کے لیے اور ان پر بھر پور نقد وتبصرہ کرنے کے لیے اختصار کے ساتھ واقعاتی مثالوں کو ذکر کیا ہے تا کہ کیے جانے والے سوال کے جواب کا ہر پہلو واضح ہو۔ اس بابت مؤلف نے دلائل نقلیہ کے نقل کرنے میں اعتدال سے کام لیا ہے اور جہاں اختلافِ فہم کی بنا پر آراء میں اختلاف واقع ہوا ہے وہاں راجح رائے کو اختیار کیا ہے اور تعارض پائے جانے کے وقت نکتہ ہائے نظر کے متعارض پہلوؤں اور ان کے دلائل کو اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ اور بعض قارئین کی تجویز پر ان معلومات سے تعرض نہیں کیا جن کا اسلامی تعلیمات سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

''رابطہ عالم اسلامی'' نے ۱۴۲۳ھ میں اس کتاب کی پہلی عربی طبع ''تساؤلات حول

الاسلام و تعلیقات" کے نام سے شائع کی۔اس طباعت میں نصف سوالات سے تعرض کیا گیا تھا۔مؤلف نے یہ کتاب اس وقت تیار کی تھی جب وہ رابطہ عالم اسلامی کے مشیر تھے اوراس کتاب کے لکھنے پر انہیں رابطہ کے جنرل سیکرٹری عزت مآب جناب دکتور عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی نے تیار کیا تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ موصوف کے پر جوش اور نہ ختم ہونے والے جذبات سے متاثر ہوکران کے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص پورے اخلاص کے ساتھ محنت کرتا تھا۔ کتاب ھذا مؤلف موصوف کی زندگی بھر کی معلومات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ علاوہ ازیں موصوف نے کتاب کی افادیت دو چند کرنے کے لیے متعدد ابحاث اوران تجربات کو بھی شامل کتاب کیا ہے جو اس موضوع پر دوسروں کے ساتھ بحث و تکرار کرتے ہوئے انہیں حاصل ہوئے ہیں۔

میں ان سب اہل قلم کا شکر گزار ہوں جن کی کتابوں اور تبصروں سے اس کتاب کی تالیف کے وقت میں نے استفادہ کیا اور اوّل و آخر حقیقی شکر رب تعالیٰ کی اس ذات کا ہے جس کی نعمتوں کو میں شمار نہیں کر سکتا اور کتاب کی افادیت میں اضافہ کی غرض سے جس تبصرہ سے بھی استفادہ کیا اس تبصرہ نگاہ کا بھی شکر گزار ہوں۔ رب کے حضور اس دعا کے ساتھ دست سوال دراز ہے کہ جس شخص نے بھی اس کتاب کی تالیف و تکمیل اور طباعت و اشاعت میں دامے درمے، سخنے، قدمے کسی بھی درجہ میں کوئی معاونت کی ہو اسے بھی اس کتاب کے اجر و ثواب میں شریک کرے اور اپنے سب بندوں کے لیے اس کتاب کو نافع بنائے۔ آمین

ڈاکٹر سعید اسماعیل صینی

مدینہ منورہ......۱۴۳۳/۶/۱ھ

فصل اوّل:

اسلام عقیدہ وعبادات اور شریعت کا نام ہے

دین اسلام عقائد وعبادات ،تشریعات اور اخلاقی اُصول وقواعد کا مجموعہ ہے، یہی وہ پیغامِ الٰہی ہے جس کو لے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے ، اور اُن کے بعد جس کی تجدید تمام حضرات انبیاء کرام ورسل اللہ العظام علیہم الصلاۃ والسلام کرتے رہے۔ جن میں حضرت نوح ، حضرت ابراہیم ، حضرت موسی ، حضرت عیسی ، حضرت خاتم النبیین محمد علیہم الصلاۃ والسلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کے نام سرفہرست ہیں جیسا کہ سورہ احزاب میں اس کی تفصیل موجود ہے (الاحزاب: ۴۰) ان حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی تمام شریعتیں انسانیت کی دنیاوی واخروی سعادت وفلاح اور کامیابی کی ضامن تھیں، البتہ اِن میں سے ہر ایک شریعت اپنے زمانی و مکانی اس ماحول کے موافق تھی ،جس میں وہ شریعت نازل ہوئی تھی۔ جب کہ حضرت محمد ﷺ کو جو شریعت عطا کی گئی وہ تمام مخلوقات ِمکلفہ جنّ وانس کے لیے عام ہے اور سب کے لیے رحمت ہے، یہ شریعت سابقہ شریعتوں کی ناسخ وخاتم ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الانبیاء : ۱۰۷)

”اور (اے محمد ﷺ !) ہم نے تم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

اور ارشاد فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيّنَ ﴾ (الأحزاب : ٤٠)

''محمد (ﷺ) تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں۔''

اسلام کے بنیادی عقائد وعبادات کیا ہیں؟:

اسلام کے بنیادی عقائد اس حقیقت پر مبنی ہیں جو اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ یہ دنیاوی زندگی ہی سب کچھ نہیں۔

اس عقیدہ کے کئی اسباب ہیں: اس جہانِ رنگ وبو میں انسان مختلف طبقات کی شکل میں اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں مثلاً: بعض لوگ زندگی میں اپنی ذکاوت یا ثروت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جب کہ بعض لوگ اپنی غباوت و بلادت یا فقر وتنگ دستی کے ہاتھوں کلفت و مشقت برداشت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسروں کی ظلم وزیادتی کے شکار ہوجاتے ہیں اور ظالم کو سزا ابھی نہیں مل پاتی، کچھ لوگ دنیاوی عیش وعشرت سے خوب لطف اُٹھا کر زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ بہت سے لوگ ساری زندگی مصائب ومشقت سے معمور زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں، اس لیے اگر صرف یہ دنیاوی زندگی ہی کامل اور مکمل زندگی ہوتی اور معاملہ یہیں کا یہیں ختم ہوجاتا تو پھر یہ اونچ نیچ اور انسانوں میں زندگی گزارنے کا ایسا تنوع واختلاف عدل کے مطابق نہیں ہوسکتا، اسی لیے اسلام نے ایک ایسی ابدی زندگی کا عقیدہ پیش کیا جس کی بنیاد عدل وانصاف پر رکھی گئی ہے، اور جہاں عدل کے مطابق محاسبہ اور انصاف کی روشنی ہی میں فیصلہ ہوگا۔

سابقہ شریعتوں کے بنیادی عقائد تمام تر یکساں رہے، جیسے رب تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اس کی اطاعت کے وجوب پر ایمان لانا، اور اس بات پر ایمان لانا کہ عبادت صرف اور صرف اسی کا حق ہے جس میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَرٰٓى اِثۡمًا عَظِيۡمًاo﴾ (النساء : ٤٨)

''بلا شبہ اللہ تعالی اس گناہ کو معاف نہیں فرمائیں گے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، اس کے علاوہ اور گناہ جس کو چاہیں گے معاف فرمائیں گے۔''

یہ بنیادی عقائد اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان لانے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ [1]

شریعت محمدیہ کی بنیادی عبادات ان ارکانِ اسلام پر مشتمل ہے:

- لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرنا
- نماز قائم کرنا
- زکوۃ ادا کرنا
- رمضان مبارک کے روزے رکھنا
- استطاعت وقدرت پر حج بیت اللہ کرنا
- یہ اسلامی ارکان کہلاتے ہیں، جن پر دین اسلام کی بنیاد ہے۔ [2]

یہ عبادات انسان کی روزانہ کی زندگی کے ساتھ مربوط و متصل ہیں مثلاً: دن میں پانچ نمازیں اپنے مقررہ اوقات پر طہارت، وضو، وغیرہ کی شرائط کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، جس سے انسان کو یہ تربیت ملتی ہے کہ وہ اپنے اوقات کی پابندی کرے اور ان کو منظّم کرے۔ اسی طرح، اس میں یہ حکمت بھی کہ نظافت و پاکی کو اپنی زندگی کا جز بنائے، اسی کے ساتھ ایک مسلمان جب اپنے خالق کے لیے کوئی عمل کرے، یا اللہ تعالی کے حقوق کی ادائیگی ہو تو اس میں اخلاص کا اہتمام کرے۔ حج کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ باہمی تعاون واتفاق کو فروغ دیا جائے اور یہ کہ: اجتماعیت کی آپس میں شدید ضرورت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عبادات اسلامیہ کے بعض اعمال بظاہر بت پرستانہ رسوم کے مشابہ نظر آتے ہیں جیسے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنا یا اس کا طواف کرنا وغیرہ؟

---

[1] ان عقائد کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۵ اور صحیح مسلم، کتاب الایمان میں ہے۔

[2] صحيح مسلم: الإيمان

مگر ان دونوں باتوں کا مظہر اسلامیہ اور بت پرستانہ رسوم میں زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ یہ کہ اسلامی عبادات و اعمال سب کے سب اللہ تعالی کے احکام واوامر کی ادائیگی مکمل اطاعت کے طور پر کی جاتی ہے، جب کہ مسلمانوں کے علاوہ جو لوگ پوجا پاٹ کرتے ہیں، چاہے وہ منطقی ہوں یا غیر منطقی وغیر عقلی سب کی سب انسانوں کی خود ساختہ ہے جس کا اللہ تعالی کی اصلی تعلیمات سے کوئی جوڑ نہیں۔

واضح ہو کہ عبادات اسلامیہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتی ہیں خواہ زندگی کے طور و طریقے اور اسباب عیش وعشرت میں کتنی ہی تغیر وتبدیلی کیوں نہ آجائے ، سوائے تنگی کی صورتوں کے کہ ان میں بعض افعال کی ظاہری صورت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے جس کا منشا انسانوں پر شفقت اور ترقی کرنا ہوتا ہے جیسے سفر میں نماز قصر اور عذر معذوری اور سفر میں رمضان کے روزوں کو دوسرے ایام میں ادا کرنے کی مہلت دینا وغیرہ...... یہ چیزیں آغازِ اسلام ہی سے ثابت ہیں اور احکام بھی ان معتقدات میں سے ہیں جو تبدیلی کو ہرگز قبول نہیں کرتے تو وقتی تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔

جہاں تک اُن اسلامی اصول ومبادی کا تعلق ہے جو انسانوں کے باہمی معاملات و تعلقات سے متعلق ہیں وہ زمانہ کی تبدیلیوں اور وسائل واسباب کے تغیرات وتقلبات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ،لیکن دینِ اسلام چونکہ تمام آسمانی شریعتوں خاتم اور دونوں جہانوں کے لیے ہے اس لیے اس میں اللہ جل شانہ نے ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ یہ ہر زمان ومکان میں قابلِ عمل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چودہ صدیاں قبل کی شریعت کی تطبیق کیونکر ممکن ہے؟:

بعض لوگوں کو اس بات پر شدید حیرت ہوتی ہے کہ اسلام جو چودہ سو سال قبل آیا تھا بھلا اس کی پیش کردہ تشریعات اس دور کے مناسب کیونکر ہو سکتی ہیں؟ جب کہ زمانہ میں کس قدر تبدیلی آچکی ہے؟

لیکن یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ انسانوں نے جو قوانین اور دستور وضع کیے ہیں ان

پر صدیوں سے عمل ہو رہا ہے، تو کیا وہ دستور وقانون جو انسان کے خالق جل مجدہ نے بنایا وہ اس قابل نہیں کہ زمانہ کا ساتھ دے سکے؟ جب کہ اللہ رب العزت کی ذات عالی جو ماضی وحال اور مستقبل کی ہر شیء سے واقف وباخبر ہے۔

اگر یہ سوال ایک مسلمان کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟

ایسا سوال کرنے والا مسلمان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جب وہ اس بات پر ایمان لے آیا کہ شریعتِ اسلامی، اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ ہے، اور یہ قطعی ویقینی ہے جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو اب اس میں شک کرنا مسلمان کو کفر تک پہنچادے گا، جس کے نتیجہ میں وہ عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا، پس جس اللہ تعالی نے کائنات کو وجود بخشا وہ اس بات پر یقیناً قادر ہے کہ وہ ایسی شریعت نازل فرمائے جو قیامت تک کے ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے قابلِ عمل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو، اس لیے اللہ تعالی کی شریعت پر جو انسانوں کا اور سب مخلوقات کا خالق ہے، کسی قسم کے اعتراض اور شک کی جراءت نہیں کرنی چاہیے۔

اس کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۝﴾

(سورۃ النساء: ٦٥) [1]

""تمہارے رب کی قسم وہ مؤمن نہیں یہاں تک کہ وہ تمہیں (اے محمد! ﷺ) اپنے معاملات میں حکم بنالیں، اور پھر تمہارے کیے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں اور مکمل تابع دار ہو جائیں۔""

یہ سوال کرنے والا مسلمان یہ بات بھول جاتا ہے کہ اسے سرے سے یہ اختیار ہی حاصل

---

[1] نیز دیکھئے: آیت: ٥٩، ١٠٥، سورۃ آل عمران: ٢٣، ٢٤، سورۃ مائدہ: ٥٠، سورۃ انعام: ٥٧، ١٠٥، سورۂ یوسف: ٤٠، الشوری: ١٠، سورۂ نور: ٤٧، ٤٨، ٥١۔

نہیں کرو۔ اللہ تعالی کے اوامر اور احکام میں سے جس کو چاہے اختیار کرے اور جس سے چاہے تجاہل برتے، اور دور رہے، اس لیے کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرہ: ٨٥)

''تو کیا (تم) بعض کتاب کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ سو جو تم میں سے یہ کام کرتا ہے اسکی سزا اس کے سوا ور کچھ نہیں کہ دنیا وی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب پہنچائے جائیں گے۔ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل (بے خبر) نہیں۔''

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس جگہ انقیاد وتسلیم کی اقسام کی طرف اشارہ کرتے جائیں۔ انقیاد وتسلیم کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:

۱۔ اللہ تعالی کی شریعت کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور جس چیز کی نسبت اللہ تعالی کی شریعت سے ہو اس کو منِ وعَن تسلیم کرنا، خواہ یہ نسبت صریح وواضح ہو یا استنباط اور قیاس کے طریقے سے مستفاد ہو۔

۲۔ ان نصوص کو ماننا جن کا ثبوت اور دلالت قطعی ہو اور انہیں کسی قسم کے اعتراض اور بحث کے بغیر تسلیم کرنا۔

۳۔ بعض مسالک فقہیہ یا بعض فقہی آراء واستنباطات کو اس طور پر ماننا جو اسلام کے موافق ہوں نا کہ غیر موافق۔

آخر الذکر کے سلسلہ میں ایک مسلم کے علم کے مطابق ترجیح کی حد تک انقیاد وتسلیم مقبول ہے، اور یہ سنت سے ثابت ہے، البتہ یہ خیال کرنا کہ یہی مسلکِ فقہی یقینی طور پر حق ہے اور دوسرا غلط ہے، یا یہی فقہی رائے یقینی طور پر برحق ہے اور دوسری کوئی رائے اس کے مثل برحق یقینی نہیں تو ایسا خیال رکھنا جائز نہیں، البتہ دلیل قطعی کی روشنی میں کسی رائے پر جمنا اور اس کو

حق ماننا یہ دراصل اصول کی تابعداری ہے، نہ کہ مسلک کی۔

اس سلسلہ میں ایک چیز ہمیشہ پیشِ نظر رہے، کہ کسی ملک کی عدالتی احکام اور فیصلوں میں کسی ایک ہی مسلک ومکتبِ فکر کو اختیار کرنا، یا بعض مخصوص مراجع ومصادر کو معین کرنا اس کے منافی نہیں جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کیونکہ اس میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ احکام میں تعارض نہ پیدا ہو، اور ایسا کرنا از روئے ضرورت جائز ہے، نہ اس لیے کہ کسی ملک میں کسی فقہی مذہب کو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بس وہی مذہب ومسلک برحق ہے اور دوسرے مسالک ومذاہب فقہیہ غلط ہیں۔ [1]

اس بات کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب قاضیوں کا تمام قضایا میں ایک ہی رائے پر متحد ہونا لازمی ہے، کیونکہ عوامل تعدد کثیر ہیں۔ ایک سچا پکا مسلمان اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ تشریعات اسلامی اور دینی اصول ومسلمات دنیا وآخرت میں انسان وجنات کی سعادت وکامیابی کی ضامن ہیں، جو مکلّف مخلوقات ہیں یا یہ تشریعات ایک محدود معاشرے کی کامیابی کی ضامن ہیں۔ بشرطیکہ ان تشریعات کے بڑے حصہ پر عمل کر یا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دینی تعلیم وشریعتِ اسلامی صرف دنیاوی کامیابی پر منحصر نہیں بلکہ دائمی اور ابدی زندگی کی فلاح وکامرانی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لیے ایک مسلمان کو مناسب نہیں کہ وہ اسلامی شریعت اور اس کے مسلمہ اصول ومبادی سے ناواقف وجاہل ہو، اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات پیوست ہونی چاہیے کہ یہ اسلامی شریعت اللہ تعالی کی جانب سے ہے، اس کے جیسی کوئی شریعت نہیں، اس کے جیسا کوئی قانون واصول نہیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے جو خالق ہے اور مالک ہے، وہ خوب واقف ہے کہ کون سی چیز دنیاوی اور اخروی ابدی زندگی کی سعادت وفلاح کی ضامن ہے اور کون سی نہیں۔

---

[1] القاسم، ص: ۲۳۳، ۲۷۳. مراد وہ مخلوقات ہیں جن کو رب تعالیٰ نے خیر وشر کے اختیار میں مکمل آزادی دی ہے اور رسولوں کے واسطہ سے ہدایت سے بھی نوازا ہے اور ان کو اس ہدایت کے حاصل کرنے کی اور اس کے موجب پر عمل کی قدرت سے بھی نوازا ہے۔ یہ جن وانس ہیں۔ کشف الغیوم عن القضاء والقدر اذا السماعیل۔

مذہب اسلام کے عمومی قواعد واصول ایسے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبہائے حیات سے متعلق ہیں،اس میں عقائد وعبادات کے ساتھ ساتھ معاملات ومعاشرت اور عمومی آداب سب ہی شامل ہیں یہ ایک ربانی ہم آہنگ تشریعی وحدت ہے جو انسان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ، انھیں سے خالق ومخلوق کے تعلق کا علم ہوتا ہے ، اور انھیں اصول وقواعد اور تعلیمات دینیہ سے انسان کو دوسری مخلوقات کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری اور تعلق کا پتہ چلتا ہے، یہی وہ مذہب ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کے بنیادی مسائل ومشکلات کا حل پیش کرتا ہے،اور گویا یہ دین حنیف اس کی بنیادی ضرورت ہے۔

اس دین برحق نے زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا جس کے لیے تعلیم اور اصول وضوابط مقرر نہ کیے ہوں ، جو باہم ہم آہنگ اور مربوط ہیں جن میں کوئی تضاد واختلاف بھی نہیں ، ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ دین خالق جل مجدہ کی وحدانیت ہی کی کرشمہ سازی ہے،اس دین حق کے بنیادی اور عمومی قواعد ومسلمات اتنے جامع ہیں کہ ان سے بے شمار فروعی اصول وقواعد نکالے جاسکتے ہیں۔

نیز اسلام کے مختلف موضوعات پر نظر ڈالنے سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ مذہبِ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اپنے اندر حقیقت اور واقعیت رکھتا ہے،اس میں فردِ واحد اور جماعت کے حقوق کے درمیان ہم آہنگی ہے،اسی طرح اس دین اسلام نے دنیاوی زندگی اور ابدی ودائمی حیات اخروی کے درمیان بھی توازن قائم کیا ہے،جس میں کوئی افراط وتفریط نہیں اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ان کمزوروں کے بھی حقوق بتادیئے گئے تھے جن کو انسانی وضعی قوانین آج ثابت کررہے ہیں ،اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی انسانیت اسلام کے پیش کردہ حقوق جیسے حقوق بنانے سے قاصر ہے۔

شریعتِ اسلامی کا حالات وواقعات سے ربط وتعلق کی نوعیت:

ایسا ممکن ہے کہ اللہ تعالی بعض لوگوں کو ایسی فراست اور شعور وفہم عطا فرمادیں جس کی روشنی میں وہ ربانی تشریعات کی بعض حکمتوں سے واقف ہوجائے۔لیکن وہ لوگ اس بات کا

دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتے کہ ان میں تشریعات ربانیہ کی سب حکمتوں کے جاننے کی اور ان کی مکمل معرفت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر شریعت کے عمومی یا جزئی مسئلہ کی حکمت مخفی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قابل عمل نہیں اور اس میں زمانہ کے مسائل کا حل نہیں اور زمانہ کے ساتھ چلنے سے قاصر ہے۔

جو شخص بھی اسلامی اعمال پر گہری نظر ڈالے گا، وہ یقیناً اس بات کے اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ اسلام ہر زمان ومکان پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، مثلا عبادات میں نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا، اگر پانی دستیاب نہ ہو سکے تو وضو اور غسل میں تیمّم سے کام چلا سکتے ہیں اور تیمّم وضو اور غسل کا بدل ہے، مسافر کی رعایت میں اس پر قصر نماز ہے، وہ چار کی جگہ دو رکعت پڑھنے کا مکلّف ہے، جبکہ مقیم پر پوری نماز کو ادا کرنا لازم ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص دیگر متعدد احکام شرعیہ اور نازل ہونے والی وحی پر گہری نظر ڈالے گا تو اسلام کو ہر زمان ومکان کے ساتھ ہم آہنگ پائے گا، اور اس میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے گا، اس لیے کہ یہ دین حنیف وقتی اور سرسری نہیں بلکہ ۲۳ر کی طویل ترین مدت میں مرحلہ وار اس کی تعلیمات واحکام واوامر نازل ہوئے ہیں، مثلاً: شراب کی حرمت ہی کو لے لیجئے کہ اس کی حرمت کا حکم بتدریج نازل ہوا نا کہ دفعتاً نازل ہوا۔

اسی طرح اسلام کی وسعت کو ایک انسان مسائل فقہیہ کے اندر معقول اور مقبول اختلاف کے باوجود ضیق وتنگی سے مبرا پائے گا۔

دورِ نبوت میں نصوص اور واقعات میں ہم آہنگی ہی کو لے لیجیے جس کا تعلق ناسخ اور منسوخ سے ہے کہ ایک نئی نص ایک قدیم نص کو منسوخ کر دیتی ہے۔ یعنی جس وقت جس چیز کی ضرورت تھی اسی کا حکم دیا گیا اور جس وقت وہ چیز مناسب نہ تھی اس کو منسوخ کر دیا گیا، اور اس وقت کے مطابق دوسرا حکم نازل فرما دیا گیا۔

یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ: کسی حکم کو کسی وقت منسوخ قرار دے دیا جاتا ہے، اور کسی وقت کسی منصوص علیہ اور متعین شدہ حکم کو وقتی طور

پر موقوف کر دیا جاتا ہے مگر منسوخ نہیں کیا جاتا، کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اس کی مثال مصارفِ زکوۃ کی اس قسم سے دی جاسکتی ہے جس کو قرآن کریم نے ''مؤلفة القلوب'' کے لفظوں سے یاد کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس قسم کو موقوف کر دیا گیا، جب کہ عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ قسم معمول بہ تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد فاروقی میں بہت سے کافروں نے زکوۃ کی اس قسم کو غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا وہ یوں کہ اپنے کفر پر اڑے رہنے کے باوجود زکوٰۃ لے لیتے تھے۔ اسلام عہد فاروقی میں بلندی کے بامِ عروج پر تھا اس لیے اُس وقت میں زکوۃ کی اس قسم کو موقوف کر دیا گیا، [1] اسی طرح قحط سالی کے ایام میں چوری کی حد کو موقوف کر دیا گیا تھا۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان احکام کو منسوخ نہیں فرمایا تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے بلکہ وقتی طور پر موقوف فرما دیا تھا، اور وجہ اس کی یہی تھی کہ ان احکام کی تنفیذ کی شرائط مفقود تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی حکم کے منسوخ ہونے میں اور اس کی تطبیق کی شرائط کے معدوم ہونے کے وقت اس کے موقوف ہونے میں واضح فرق ہے۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنی تغلب کے نصاری سے جزیہ معاف کرنا ان پر سے جزیہ کو ساقط کرنا نہ تھا بلکہ آپ نے اس کے نام کی تبدیلی فرمائی نیز اس کی مقدار میں اصلاح فرمائی، اس لیے کہ اُن سے زکوۃ کی مقدار سے دوگنا وصول کیا جارہا تھا۔ [3]

پس معلوم ہوا کہ کسی حکم میں اصلاح وتبدیلی کرنے اور اس کو منسوخ اور ختم کرنے میں واضح فرق ہے اور یہ اصلاح وتبدیلی مفاد عامہ کی خاطر کی جاتی ہے۔

اسی طرح وہ ٹیکس جو آج کل اسلامی حکومت ایک فرد پر عائد کرتی ہے وہ ٹیکس بسا اوقات ایک شخص کی سالانہ بچت کو اس طور پر ختم کر دیتا ہے کہ سال گزرنے پر اسے زکوٰۃ ادا

---

[1] الشوری، ص: ٤٣٨ از نحوی [2] مسند الشافعی ج١/ ٢٢٤.

[3] ابو یوسف ص١٢٩، ١٣٠.

کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کہ اس کے پاس اتنا مال ہی نہیں بچتا کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ اسی ضمن میں وہ معمولی جزیہ بھی آتا ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم باشندہ پر سالانہ لاگو کرتی ہے ۔ ان تطبیقات سے خلیفہ راشد ملہم من اللہ سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حکمت اور شریعت کو احسن طریق کے ساتھ منطبق کرنے کی شدید تمنا کھل کر سامنے آتی ہے۔ سریعت کو تدریجاً اور مرحلہ وار نازل کرنا رب تعالیٰ کی شریعت کا مقتضیٰ تھا اور یہ حقائق ایک اسلامی حکومت پر اس بات کو لازم کرتے ہیں کہ وہ بھی احکامِ شرعیہ کو لاگو کرنے میں حکمت سے کام لے۔ بالخصوص جب ان احکام کی تطبیق کا دور ایک مدت بعد آیا ہو۔ اہل اسلام کے ہاتھوں میں جب اقتدار آجائے تو لازم ہے کہ وہ اصلاح کے عمل میں تدریج سے کام لیں اور ایسی جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیں جس کا نتیجہ اکثر اوقات اُلٹا ہی نکلتا ہے اور اگر بعض غیر اسلامی ناموں اور علامات کا مآل شریعت اسلامی کے اجراء کی صورت میں ہی نکلتا ہو تو ان سے چشم پوشی کرنا بھی حکمت شریعت کا مقتضیٰ ہے۔

شریعتِ اسلامی کی دائمی وابدی اہم خصوصیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اسلامی احکام واوامر مکلّف انسان کے اسبابِ معیشت اور نت نئے تغیر پذیر وسائل کے ساتھ ساتھ بدلے جاتے ہیں کیونکہ اسلام تمام آسمانی رسالتوں کا خاتم ہے۔ اس کی تعلیمات اور احکام واوامر تمام جہان کے لیے عام ہیں، اس لیے اللہ رب العزت جو اس کائنات کے پیدا کرنے والے ہیں اور جس نے یہ شریعت نے نازل فرمائی اس ذاتِ عالی نے اس شریعت کے اندر ایسی جامعیت اور صلاحیت رکھی ہے کہ یہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے قابل عمل ہے۔ [1]

اس سلسلہ کی بعض خصائص اور صفات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ا۔ قرآن وسنت میں وارد قطعی الثبوت احکام کا عمومی قواعد واصول کی روشنی میں تعیین اور

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: القاسم: ۱۹۷، ۲۰۴

یہی تفصیلی شریعات اور استثناء ات کا محور و مدار بھی ہے۔ مثلاً: اللہ تعالی نے جن کاموں کا حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے اُن میں اُس کی اطاعت کرنے، عدل کو اختیار کرنے اور ظلم وجور سے دور رہنے، بیع وشراء کو حلال سمجھنے اور سود وربا کو حرام ماننے وغیرہ جیسے امور کی تاکید اور ان کو بے چون وچرا قبول کرنا، یا شادی کے سلسلہ میں مردو عورت کے باہمی تعلقات کو تسلیم کرنا وغیرہ وغیرہ جیسے امور اور تغیرات کا زیادہ تر تعلق زندگی کے اسالیب اور وسائل سے ہوتا ہے۔ البتہ انسان کی بنیادی ضروریات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

۲۔ رب تعالیٰ نے اسلام کے بنیادی اصول وقواعد ایسے طے فرمائے ہیں جن میں مخلوق کی فطری، روحانی، عقلی اور نفسیاتی کیفیات اور اس کی اساسی ضروریات واحتیاجات کی بھر پور رعایت رکھی ہے ۔انہی بنیادی ضروریات میں ایک بات یہ ہے کہ سب مخلوقات ایک ایسی مخفی قوت کی محتاج ہوتی ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے لیے خیر کو حاصل کر لیں اور اپنے پر سے شر کو دفع کر دیں اور وہ ایسی معلومات اور عقلی قدرت کی بھی محتاج ہوتی ہیں جس کی بدولت وہ ایسے ماحول کا مقابلہ کر سکتی ہیں جس میں وہ رہ رہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ کھانے پینے کی بھی محتاج ہوتی ہیں۔

۳۔ اسلام میں اور بالخصوص سنت نبویہ میں ایسے ثابت شدہ اوامر واحکام بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں جن میں تبدیلی اور تغیر نہیں ہوسکتا ،مثلاً مکلّف (جن وانس) کی دنیا وآخرت میں سعادت وکامیابی، یا واجبات یا وہ چیزیں جن کی حرمت قطعی طور ثابت ومسلم ہے۔ ان مسلمات کو ہم ثوابت کہہ کر پکارتے ہیں اُن مسلمات اور اوامر واحکام کے مقابلہ میں جو حالات وتقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں جیسے مستحبات، مکروہات اور مباحات۔

پس بعض احکام میں تغیر وتبدیلی اگرچہ اسباب ووسائل کی تبدیلی کی وجہ سے ناگزیر ہو جاتی ہے، تاہم اس تبدیلی کی وجہ سے یہ احکام واوامر اور اصولِ شریعت اور اس کے قواعد اپنی طبعی اور فطری خاصیت سے نہیں نکلتے یہ تشریعاتِ ربانیہ اسی فطرت کی معاونت وتذکیر کے

لیے نازل ہوئی ہیں۔ یہی وہ فطرت ہے جو دنیاوی ضرورتوں کی سعادت اور اخروی ضرورتوں کی سعادت کے درمیان توازن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ شریعت اسلامی ہی شریعتِ ربانی اور خدائی شریعت ہے اس لیے یہی اس بات کا تعین کرے گی کہ: کیا حلال ہے اور کیا حرام اور کیا مباح، کیا انسان کے لیے مفید ہے اور کیا مضر، کیا فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور کیا اس کی فطرت کے خلاف، کیونکہ یہ شریعت اس ذات عالی کی جانب سے ہے جس کا علم کائنات کے ذرّہ ذرہ پر محیط ہے، اور وہ ہر چیز سے واقف اور باخبر ہے، اس کے علم میں ہے کہ کونسے وسائل واسباب فطرت کے محافظ ہیں اور کون سے اسباب فطرت کے متعارض ومتصادم ہیں۔

لوگوں کے مزاج اور ان کے نظریات وخواہشات اس قابل نہیں کہ وہ شریعت اسلامیہ کے احکام کی حکمتوں اور اس کے اسرار ورموز سے بہرہ ور ہوسکیں اور اس کا کلی ادراک کرسکیں، خواہ کوئی کسی میدان میں کتنا ہی علمی تفوق اور امتیازی شان کا حامل ہو، اس لیے کہ لا محالہ انسان کا علم اور اس کی معرفت کا دائرہ محدود ہے، جو کچھ وہ حواس خمسہ کے ذریعہ معرفت حاصل کرتا ہے اس تک تو اس کی کچھ رسائی بھی ہے اور جو کچھ ان حواس کے علاوہ اس کی معلومات اور معرفت کا دائرہ ہے وہ نہایت کمزور وضعیف ہے، اس لیے زبردست علمی ترقی اور اکتشافات کے باوجود انسان پر بہت سی حقیقتیں مخفی ومستور ہیں۔ باوجودیکہ وہ ان حقائق کے ساتھ تو معاملہ کرنے پر مجبور ہے کہ ان کی معرفت کا ادراک ہو یا نہ ہو لیکن وہ ان کو ماننے پر مجبور ہے۔

۴۔ خالق جل مجدہ نے اسلامی شریعت کی اساس درج ذیل مصادر پر رکھی ہے:

ا۔قرآن کریم:

یہ اللہ تعالی شانہ کی نازل کردہ کتاب ہے، جس کے حروف اور معانی سب اللہ تعالی ہی کے نازل کردہ ہیں، یہ کتاب اپنے مضمون اور قالب (یعنی معانی اور حروف) دونوں کے اعتبار سے اللہ کا کلام ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اُس مالک کون ومکان نے خود ہی لیا ہے، روایۃً بھی اور کتابۃً بھی، چنانچہ قرآن کریم کی سند آج کے حفاظ سے لے کر رسول اللہ ﷺ

تک بلا انقطاع اور متصل محفوظ ہے، اسی طرح یہ کتاب عظیم رسم الخط اور کتابت کے لحاظ سے یہ شان رکھتی ہے کہ اس کا زیر وزبر اور حرکات وسکنات سب بعینہ وتمامہ موجود ومحفوظ ہے۔

۲۔سنت نبویہ (علی صاحبہا الف الف صلاۃ وسلام):

اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کا قول وفعل اور تقریر ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں، کہ سنت نبویہ قرآن پاک کی زندگی کے تمام شعبہ جات میں عملی تطبیق کی شکل میں تصویر وتفسیر ہے، سنت نبویہ کی حفاظت اور اس کی اصلی صورت پر بقاء نہایت اہتمام وتدقیق کے ساتھ عمل میں آئی، جس کے لیے اصول وقواعد مرتب ہوئے جن کی روشنی میں صحیح وحسن اور ضعیف وموضوع احادیث کی تمیز کی گئی اور آج یہ ذخیرۂ احادیث رسول اللہ ﷺ تک سند متصل کے ساتھ موجود ومحفوظ ہے۔

۳۔اجتہاد:

اسلامی شریعت کا تیسرا مصدر اجتہاد ہے، جس کے ذریعہ سے قرآن کریم اور سنت نبویہ کی روشنی میں مسائل زندگی کا حل نکالا جاتا ہے، اس کی بنیاد اور اساس تو قرآن کریم ہی ہے تاہم زندگی کے نت نئے مسائل کا حل عقلِ سلیم کے ذریعہ تلاش کیا جاتا ہے بالخصوص اُن امور میں جن کا ذکر یا اشارہ کتاب وسنت میں نہیں ملتا، اس میں شرط یہ ہے کہ تلاش کردہ کتاب وسنت کے نصوص سے متصادم نہ ہو۔پس اجتہاد یہ کتاب وسنت سے بالواسطہ یا بلا واسطہ احکام تطبیقیہ کے نکالنے کا نام ہے۔اسی اجتہاد کے تحت وہ قیاس بھی آتا ہے جس کے ذریعے قران وسنت میں وارد احکام کے ذریعے ان احکام تک پہنچا جاتا ہے جن کا ذکر قرآن و سنت میں نہیں آتا۔ اسی طرح خالص عقل اور فطرتِ سلیمہ سے کام لینا بھی اجتہاد کے تحت داخل ہے تاکہ زندگی میں پیش آنے والے نت نئے مسائل کا سامنا کیا جا سکے۔البتہ یہ شرط ہے کہ اجتہاد قرآن کریم کی نصوص اور معتبر وثابت سنن نبویہ کے صحیح فہم کے متعارض ومتصادم نہ ہو۔ اس کی مثال ان مقامی دساتیر کو حکم بنانے ہے جو مختلف ماحولوں کے ساتھ شریعت اسلامی کے ہم آہنگ ہو جانے کی قدرت وصلاحیت دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اجتہاد کے تحت جن مصادر کے نام آتے ہیں وہ یہ ہیں:
قیاس ، استحسان، عرف ، مصالح مرسلہ، سد ذریعہ اور استصحاب۔ ذیل میں ہر ایک کا تعارف اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

قیاس: ......کسی فقہی مسئلہ کو جس کا حکم واضح نہ ہو کسی ایسے مسئلہ فقہیہ پر قیاس کرنا جو کتاب وسنت میں مذکور ہو اور اس میں وہ علت ووجہ موجود ہو جو پیش آمد مسئلہ میں پائی جاتی ہے اس کو قیاس کہتے ہیں۔ اس کی مثال جیسے وصیت کرنے والے کو اس شخص نے قتل کر دیا جس کے لیے وصیت کی گئی تھی تو اب وہ وصیت سے محروم ہو جائے گا، قیاس کرتے ہوئے اس مسئلہ پر کہ وارث نے اگر مورث کو قتل کر دیا تو وارث وراثت سے ازروئے سنت محروم ہو جائے گا۔

استحسان: ......اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے حکم میں اس جیسے دوسرے مسئلہ کے حکم سے ہٹ جانا، کسی ایسی مصلحت کے پیش نظر جو نصوص سے متعارض نہ ہو۔

عرف : ......اس سے مراد وہ معاملات اور امور جن پر لوگ قائم ہوں اور اُن پر چلتے ہوں۔

مصلحتِ مرسلہ :......اس سے مراد وہ مصلحت ہے جو معروف ہو لیکن کتاب وسنت میں اس کا ذکر نہ ہو۔

سد ذرائع :......اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ بھی حرام قرار دینا جو عموماً حرام تک پہنچا دینے والا ہو۔

الاستصحاب :......اس سے مراد یہ نہیں کہ اس کے ذریعے کسی نئے شرعی قاعدے تک پہنچا جائے بلکہ اس سے مراد واقعتہ کی تشخیص ہوتی ہے، مثلاً اگر ہمارے پاس کسی کے بارے میں یہ دلیل ہو کہ اس نے فلاں عورت سے شادی کر لی ہے تو اب وہ میاں بیوی ہی ہیں اِلا یہ کہ کوئی ایسی دلیل سامنے آجائے جو ان دونوں کے درمیان طلاق کو ثابت کر دے۔

ان اجتہادی اقسام میں عقل کو کافی دخل ہوتا ہے، عُرف کا بھی تشریع اسلامی میں دخل

ہے کہ مقامی احوال کے لحاظ کرتے ہوئے شریعت کی روشنی میں عرف پر عمل کیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ جملہ مصادر ومراجع ایسے ہیں جن میں اس بات کی گنجائش ہے کہ آراء و افکار متعدد ہوں اور نصوص شرعیہ اور زندگی کے بدلتے اسالیب و وسائل کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو۔

نیز یہ اسلامی قیاس واجتہاد اُس قیاس واجتہاد سے بالکل مختلف ہے جس کی بنیاد محض انسانی قاصر عقل پر ہو یا اس کا مدار فطرتِ بشریہ کی اقدار سے منحرف ہو یا اس میں غالب عنصر احکام کو خواہشاتِ نفسانیہ کے تابع بنانے کا ہو۔اس لیے کہ انسانوں کے نظریات اور ان کی چاہتیں بعض دفعہ فطرت سلیمہ سے منحرف ہوتی ہیں، اس لیے قیاس واجتہاد کے مقبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اساس صرف بشری عقل پر نہ ہو بلکہ وحی ربانی کی روشنی میں ہو، ورنہ محض عقل کی بنیاد پر یا اکثریت کی بنیاد پر کیا جانے والا قیاس واجتہاد شرعاً مردود ہوگا۔

اس مقام پر اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ شرعی اجتہاد کے لیے چند ایسی شرائط کا ہونا ضروری ہے جو مجتہد میں پائی جاتی ہوں۔اس کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

حدیث شریف میں وارد ہے:

((إذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسه فإن فی إحدی جناحیه داء وفی الأخری شفاء)) [1]

''اگر تم میں سے کسی کے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اس کو مزید اس میں ڈبودو، اس لیے کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسر پَر میں شفا ہے۔''

اس حدیث پاک سے ممکن ہے کوئی تشریع اسلامی کے اصولوں سے ناواقفیت کی بنا پر یہ سمجھے کہ یہ حکم الزامی اور وجوبی ہے کیونکہ حدیث پاک میں امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری باب بدء الخلق.

ممکن ہے کہ کسی کو اس سے بھی آگے کی سوجھے، وہ یہ کہ وہ اس حدیث سے استدلال کر کے بازار میں رکھی کھانے پینے کی اشیاء کی نظافت سے دست بردار ہو جائے اور دراصل اس کا ارادہ حدیث کے استہزا کا ہو، لیکن وہ تو خود اپنے ساتھ استہزا کر رہا ہوتا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اپنی اس بات میں وہ مخلص بھی ہو۔ ہر حدیث شریف کے مفہوم سمجھنے کے لیے اور مسائل کے استنباط کے لیے ضروری قواعد واصول کی تعلیم حاصل کرنا لازم ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ حدیث شریف ایک علمی حقیقت کو واشگاف کررہی ہے اور وہ بھی پینے والی اشیاء میں، جب کہ انسان ایسی چیز کو استعمال کرنا چاہے جس میں مکھی کرگئی ہو نا کہ اس حدیث سے استدلال کر کے بے سوچے سمجھے اس کے حکم میں تعمیم کر دے۔

اسی طرح بعض مسلمانوں کو اس حدیث بالا اور اس طرح کی دوسری احادیث مثلاً وہ حدیث شریف جس میں اونٹ کے پیشاب سے بعض امراض میں شفا کا ذکر ہے، تعجت اور حیرت کرتے ہیں، اوراس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ [1]

دوسری جانب یہی لوگ عصر حاضر کی نئ تحقیق کو بسر وچشم قبول کر لیتے ہیں، مثلاً نئ تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ اژدھے کا زہر بعض علاج میں مفید ہے اور بعض امراض کی احتیاطی تدابیر میں اس کا استعمال نافع ہے وغیرہ وغیرہ......۔

مسلمانوں کے بعض نصوص پر اعتراض کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایسے مسلمانوں کی دینی تعلیم کم ہوتی ہے، جبکہ مغربی تعلیم سے وہ نہ صرف یہ کہ آشنا بلکہ بڑی حدتک اس میں ان کو دسترس حاصل ہوتی ہے، ایسے افراد شریعتِ اسلامی کے اہم امور سے ناواقف ہوتے ہیں جن کی رعایت رکھنا مسلمان کی ذمہ داری ہے، مثلاً: صفائی ایمان کا جزء ہے اور ''نہ کسی سے تکلیف اُٹھاؤ اور نہ کسی کو تکلیف دو۔''

تشریعاتِ اسلامیہ پر اعتراض کی غالب وجہ اہل اسلام کا نصوصِ اسلامیہ کوملحدانہ نکتۂ نظر سے دیکھنا ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس پر دینی معاملات کی حکمتیں اوراس کی خوبیاں مخفی رہتی ہیں

[1] صحيح بخاری : كتاب الجهاد

لیکن اگر وہ اپنے لادینی افکار ونظریات کا بغور جائزہ لےتو وہ خود بھی ان پر انکار کرے گا۔

۴۔اجماع:

یہ بھی اجتہاد ہی ہے لیکن اس اجتہاد میں ایک اضافی قوت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اس اجتہاد پر ایک مخصوص زمانے کے علماء کا اجماع منعقد ہو جاتا ہے۔مثلاً صحابہ کرام کا کسی امر پر اتفاق ہو یا تابعین کا کسی مسئلہ پر متفق ہونا ، اس کی اہمیت ووقعت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کے بعد سب سے زیادہ ہے ،اسی لیے علماء اصول اس کو قرآن وسنت کے بعد تیسرے نمبر پر رکھتے ہیں اور یہ ترتیب قوت کے اعتبار سے ہے نا کہ زمانی تسلسل کے اعتبار سے ہے۔اس کی وجہ سے تشریع اسلامی میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ زمانہ کی نئ نئ مشکلات اور نت نئے مسائل کا حل وحکم پیش کرسکتی ہے ، اگر چہ تشریع اسلامی کی بنیاد ایسے اصول وقواعد پر ہے جن کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے ،تاہم اس میں اس کی گنجائش ہے کہ اسلامی شریعت کی روشنی اور اس کے عمومی اصول وضوابط کی روشنی میں کسی بھی نئے مسئلے کو پرکھا جائے اور اس کا حکم معلوم کیا جائے ، اس سلسلہ میں چند صورتیں سامنے آتی ہیں جو معقول اور مقبول ہیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

ا۔ پہلی صورت :......نصوص میں سے بعض کو حجت اور دلیل بنانے اور بعض کو نہ بنانے میں اختلاف رائے ممکن ہے ، اسی طرح مجتہدین کے مابین نصوص میں ترجیحات کی بنیادیں بھی متعدد ہوسکتی ہیں ، نیز نصوص کے تحقیق وتدقیق کے سلسلہ میں صرف عقل انسانی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ناقص ہے ، چنانچہ اگر صرف عقل کو بنیاد بنالیا گیا تو نصوص تو کیا بہت سے موجودہ علمی اکتشافات بھی ناقابلِ تسلیم بن جائیں گے ،مثلاً : اژدھے کا زہر بہت سے خطرناک امراض میں ایک مفید دوا ہے وغیرہ تحقیقات بھی اگر عقل کی کسوٹی پر پرکھی جائیں تو انسانی عقل ان کو ردّ کردے کہ بھلا ایک زہریلے سانپ کے زہر قاتل میں تریاق بھی ہوسکتا ہے؟ اسی لیے ضروری ہے کہ معتبر نصوص پر اعتماد کیا جائے اور ان کو اصل قرار دیا جائے نہ کہ عقلِ محض کو۔

۲۔ دوسری صورت :......نصوص کی تفسیر اوران سے استنباط کے سلسلہ میں تعدد ممکن ہے اس لیے کہ سوچنے اور غور وفکر کے درجات مختلف ہوتے ہیں ، اسی طرح اصحابِ فکر کا پس منظر ان کی معلومات ، ان کی علمی رسائی کے تفاوت کے ساتھ ساتھ عبارتوں کا سیاق وسباق اور زبان کے فہم میں بھی اختلافِ درجات اور تعدد رائے کا قوی امکان ہوتا ہے۔

۳:...... واقعات کے تحلیل وتجزیہ میں بھی آراء میں تعدد واختلاف ہوتا ہے، لہٰذا کسی واقعہ کی تشخیص میں بسا اوقات لوگوں میں اختلاف ہوجاتا ہے خواہ اس سلسلہ میں نئی ایجادات اور تحقیقی وسائل ہی کیوں نہ استعمال کیے جائیں، اور خواہ یہ واقعات محسوس ومشاہد ہی کیوں نہ ہوں۔

۴:...... اسی طرح نصوص شرعیہ اور واقعات ومعاملات کے درمیان تطبیق دینے میں اختلاف رائے بھی ممکن ومعقول ہو، مثلاً : بنک کے ذریعہ سے قسطوں پر خریداری پر سود کا حکم عائد ہوگا یانہیں؟ جب کہ بنک رأس المال کے ساتھ دوسرے اموال میں بھی تصرف کرتا ہے، اور یہ بیع اعیان کی نہیں ہوتی ، اسی طرح کیا دوڑوں کا سب کھیل حرام قمار (جوے) کے زمرے میں آتے ہیں یانہیں؟

۵:...... ایک اختلاف رائے اس میں بھی ممکن ہے کہ بعض کے نزدیک بعض اصول مقبول ہوں اور دوسروں کے نزدیک غیر مقبول جیسے :استحسان ، اور اہل مدینہ کا عمل ، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی حجیت ، یا سابقہ شریعتوں کی حجیت وغیرہ۔

فصل دوم:

قضاء وقدر، جہاد اور
اللہ کے لیے دوستی اور دشمنی

عقائد اسلامیہ پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں تقدیر، جہاد اور دوستی اور دشمنی کے بارے میں اُٹھائے جانے والے چند سوالات کے جوابات دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ان اصطلاحات کی بابت ہمیشہ سے چند سوالات اُٹھائے جاتے رہے ہیں مثلاً تقدیر کے مسئلہ ہی کو لے لیجیے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس مسئلہ کو انسانی آزادی، اس کے افعال و کردار کے محاسبہ اور اہل دین کے فکر و فلسفہ اور اذہان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ چنانچہ بے شمار لوگوں نے تقدیر کو اپنی ان غلطیوں کے لیے قربانی کا بکرا بنایا جو ان کے لیے متعدد مسائل و مشکلات کا سبب بنتی ہیں۔ جب کہ بعض لوگوں نے معاشرے میں نکما، بے کار، عہدی اور نکھٹو بنا رہنے کے لیے تقدیر کو وجہ جواز بنایا۔ [1]

اسی طرح جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بات آتی ہے تو جہاد، ولاء اور براء جیسی اصطلاحات کو زیر بحث لایا اور موضوعِ گفتگو بنایا جاتا ہے اور ایسے بے شمار سوالات بھی اُٹھائے جاتے ہیں جن کی تہہ میں دراصل اسلام پر یہ تہمت دھری جاتی ہے کہ اسلام ایسے ریاستی قوانین بناتا ہے جن میں ان طاقتوروں کی مدد کی جاتی ہے جو امن پسند کمزوروں پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلام ایک ہی وقت میں بعضوں کے ساتھ

[1] کشف الغیوم عن القضاء والقدر از السماعیل۔ الانسان والقضاء والقدر، ص: ٤٢٣، ٤٥٦ از صینی.

احسان کرنے اور بعضوں کے ساتھ بغض رکھنے کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ❶

ان اعتقادی مسائل سے متعلقہ اُٹھائے جانے والے زیادہ تر سوالات یہ ہیں:

۱۔ آدمی اپنے افعال کا جوابدہ کیوں ہے؟

۲۔ جب انسان کا افعال رب کے تخلیق کردہ ہیں تو اس سے ان کی بابت پرسش کا کیا معنی؟

۳۔ جب ہر بات اللہ کی مشیت سے وقوع پذیر ہوتی ہے تو انسان کس بات کا جوابدہ ہے؟

۴۔ جب انسان تقدیر کے لکھے کے خلاف چل ہی نہیں سکتا تو اس کا محاسبہ کیونکر کیا جاتا ہے؟

۵۔ محاسبہ کیا ہے؟ اور عقوبات و مکافات کی نوعیت کیا ہے؟

۶۔ کیا جہاد کا مطلب اسلام سے انکار کرنے والوں کے ساتھ قتال ہی ہے؟

۷۔ کیا ولاء میں نصرت اور محبت کا معنی پایا جانا لازمی ہے؟

۸۔ اور کیا براء میں بغض وعداوت کا معنی پایا جانا لازمی ہے؟

اب ذیل میں ان سب سوالات کے قدرے تفصیل کے ساتھ جوابات دیے جاتے ہیں:

آدمی اپنے افعال کا جوابدہ کیوں ہے؟

بے شک انسان اپنے سارے کیے دھرے کا جوابدہ ہے۔ کیونکہ انسان ایک مکلّف مخلوق ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اس پر بے شمار احسانات کیے ہیں اور اسے اپنی بے بہا نعمتوں سے نوازا ہے۔ جن میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ ❷ انسان زمین میں ودیعت کی گئی رب تعالیٰ کی نعمتوں سے بھر پور فائدہ اُٹھاتا ہے۔ پھر انسان کو آزمانے اور اس کا امتحان لینے کے لیے رب تعالیٰ نے انسان کے لیے چند حدود کی پابندی کو لازم کر دیا جن سے تجاوز کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اگرچہ ان حدود سے تجاوز کرنے میں انسان کو بعض وقتی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور یہی انسان کا امتحان ہے کہ وہ ان وقتی فوائد کو دیکھتے ہوئے رب تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ

---

❶ حقيقة العلاقة، ص: ۸۹، ۱۱۰، از صینی.

❷ اس واقعہ کا ذکر سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۳۰، ۳۲ میں آیا ہے۔

کرے تا کہ اسے آخرت کی ابدی زندگی میں کامیابی ملے۔

رب تعالیٰ نے انسان کو جن ممتاز نعمتوں سے نواز ہے، جن کی بدولت وہ دوسری تمام مخلوقات میں نمایاں نظر آتا ہے، وہ نفع ونقصان میں فرق کرنے والی عقل، ہدایت اور اختیار کی آزادی ہے۔

رب تعالیٰ نے جن وانس کی مکلّف مخلوقات کو عقل اور بلند قوت سے ممتاز کیا ہے جن کی بدولت وہ اپنے حواس خمسہ کو پیش آنے والی اشیاء کا ادراک کر لیتا ہے اور ایک شے کو دوسرے سے جدا کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ان اشیاء کو طویل عرصہ تک محفوظ بھی رکھ سکتا ہے اور ان اشیاء سے فوری یا بدیر فائدہ اُٹھانے کے لیے ان سے اضافی معلومات بھی حاصل کر سکتا ہے۔

رب تعالیٰ نے جن وانس کو اس بات کی قدرت بھی دی ہے کہ وہ ان ربانی تعلیمات کو حاصل کر سکیں جو انہیں خیر وفلاح اور سعادت ونجات کے راستوں پر لے جاتی ہیں اور انہیں شر کے اور برائی کے رستوں سے بچاتی ہیں۔

بے شک عقل بے حد عظیم اور نہایت قیمتی نعمت ہے۔ بلاشبہ جو عقل جیسی عظیم نعمت کا مالک ہو، وہ اس لائق ہے کہ اس کا محاسبہ کیا جائے۔ مخلوقِ خدا میں سے جو بھی عقل جیسی نعمت سے محروم ہے وہ کسی حال میں بھی فضیلت و برتری کی مالک نہیں۔ لہٰذا جو انسان مجنون، مخبوط اور زندگی بھر کے لیے دیوانہ ہو جاتا ہے اس کا کوئی محاسبہ نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ نے مکلّف مخلوقات کو فطری ہدایت سے نوازا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ہر پیدا ہونے والا فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' [1]

رب تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے واسطے سے انسان کو ہدایت وارشاد کی نعمت سے نوازا ہے تا کہ اللہ کے پیغمبر انسان کو اس کا وہ عہد یاد دلائیں جو اس نے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ رب تعالیٰ کے یہ پیغمبر انسان کو زمین پر زندگی گزارنے کی بابت اسے

[1] البخاری، القدر۔

زندگی کے ہر مرحلہ اور حالت سے متعلق تفصیلی احکامات سے آگاہ کریں۔ اس بات میں کسی ذی ہوش اور صاحب عقل کو کسی قسم کا شک نہیں ہوسکتا کہ رب تعالیٰ نے مکلّف مخلوقات کو بے پناہ اختیار کی آزادی دے رکھی ہے تا کہ وہ اپنی آزادی سے جیسے چاہے فائدہ اُٹھا سکے۔ حتیٰ کہ اگر وہ چاہے تو اس آزادی کے ذریعے سے آخرت کی ابدی زندگی کو بھی اختیار کرسکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾

(الکہف: ۲۹)

''اور کہہ دو کہ (اے لوگو!) یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔''

اگر ہم اس دنیا میں ہونے والی اب تک کی تمام جنگوں کا بنظر غائر جائزہ لیں تو ہمارے سامنے نعمت آزادی کی عظمت اور قدر و قیمت کھل کر آجائے گی۔ کیونکہ یہ سب جنگیں یا تو تعبیر کی آزادی کے لیے لڑی گئی ہیں یا آزادی میں تصرف کے لیے لڑی گئی ہیں۔ چاہے ان سے مقصود آزادی کی طلب تھی یا آزادی کا دفاع تھا۔

جب انسان کے افعال رب کے تخلیق کردہ ہیں تو اس سے ان کی بابت پرسش کا کیا معنی؟

اس سوال کا جواب لفظ ''قضاء'' کی حقیقت، اس کے مشتقات، اس کے مترادفات اور اس لفظ کی طبیعت میں مخفی ہے۔ اس بابت سب سے بڑی نص جناب رسالت مآب کا یہ ارشاد ہے:

''قضاء کو دعا کے سوا اور کوئی چیز نہیں ٹال سکتی۔'' [1]

اس کی سب سے بڑی مثال ان تین لوگوں کا قصہ ہے جو ایک غار میں پھنس گئے تھے پھر ایک پتھر نے لڑھک کر غار کا دھانہ ان پر بند کر دیا تھا۔ جس پر ان تینوں نے باری باری دُعا مانگی تو رب تعالیٰ کی قدرت سے وہ پتھر غار کے دھانے سے اس قدر ہٹ گیا جس سے

[1] الترمذی، کتاب القدر۔

انہیں غار سے نکلنا آسان ہو گیا۔ [1]

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر کوئی چیز قضاء پر سبقت لے جا سکتی ہوتی تو وہ ''نظر'' تھی۔'' [2]

لفظ قضاء کے مندرجہ ذیل معانی ہیں:

۱۔ وہ امر شرعی جس کی پابندی بندہ کے ذمہ لازمی ہوتی ہے لیکن حریت اختیار کی نعمت سے اس امر کی مخالفت پر قادر بنا دیتی ہے۔

۲۔ تکوینی امر یا سنت کونیہ۔ جس کا نتیجہ حتمی ہوتا ہے اور اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ (الانبیاء: ٦٩)

''ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی بن جا۔''

چنانچہ اس امر کونی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی۔ اس حقیقت کی تائید اس ارشادِ باری تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (البقرہ: ١١٧)

''(وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

اور کبھی قضاء کی مثال سنن کونیہ سے دی جاتی ہے جن کو رب تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ سنن دو اجزاء پر مشتمل ہوتی ہیں:

(۱) سبب

(۲) اور حتمی نتیجہ

---

[1] رياض الصالحين، باب اخلاص النية.

[2] كتاب الطب لابن القيم الجوزية.

یاد رہے کہ مکلّف مخلوق سے سنن کونیہ کے حتمی نتائج کا محاسبہ نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر وہ سنن کونیہ کی بابت ان کے سبب کو اختیار کرتا ہے تو اس پر محاسبہ ضرور ہوگا۔

سنت کونیہ یا قانون طبیعی کی مثال کو یوں سمجھیے کہ آپ ایک پتھر ہاتھ میں لے کر اسے اپنے پیر کی پشت پر پھینکتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل اختیارِ سبب کہلائے گا جو قابل مواخذہ ہے۔ پھر یہ پتھر سیدھا پیر کی پشت پر جا گرے گا جو زمین کی قوتِ جاذبیت اور کشش ثقل کا حتمی نتیجہ ہے جس سے مفر نہیں۔ سوائے ایک صورت کے وہ یہ کہ آپ ایک اور سنت کونیہ کو استعمال کریں اور وہ ہے آپ کا اپنے قدم کو ہٹا لینا یا اس پتھر کا اپنے قدم سے دُور پھینکنا۔

انسان او اس کے اختیارات سے متعلقہ سنن کونیہ کی ایک اور مثال کسی قوم کے آسودہ حال لوگوں کا گناہوں میں ڈوب جانا ہے جو بالآخر انہیں تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝﴾ (الاسراء: ١٦)

''اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش پر) مقرر کر دیا تو وہ نا فرمانیاں کرتے رہے۔ پھر اس (بستی) پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اس بستی کو ہلا کر ڈالا۔''

بشری سطح پر یہ ہمارے اس قول کے مشابہ ہیں کہ جب ہم قفل کھولنے کا ارادہ کرتے ہیں تو چابی کو دائیں طرف گھماتے ہیں اور جب قفل بند کرنے کا ارادہ کریں تو چابی کو بائیں طرف گھماتے ہیں۔ پس یہ سب اپنے نتیجہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک محدود نتیجہ حاصل کرنے کے لیے عمداً یا بطورِ سہل انگاری کے ایک شخص کے لیے سبب کو استعمال کرنا ممکن ہے۔

پس ''امرنا'' سے مقصود ہلاکت کے سبب کو پیدا کرنا ہے اور وہ آسودہ حال لوگوں کا فواحش میں جا پڑنا ہے۔ پس یہاں سنت کونیہ یہ قوم کے آسودہ لوگوں کا فواحش میں پڑنا ہے (یہ سبب ہے) پھر قوم کے اکثر لوگوں کا امر بالمعروف کے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا

ہے۔(یہ دوسرا سبب ہے) پھر وہ بستی ہلاک کر دی جاتی ہے(جو نتیجہ ہے) ایسی مثالیں پیغمبروں کے قصوں میں بے شمار ہیں جن میں قوموں کے آسودہ حال لوگ فواحش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور باقی قوم انہیں ان کاموں سے روکتی نہیں جس کے نتیجہ میں وہ قومیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ جیسے حبیب نجار کا قصہ معروف ہے۔ ابلیس اور زلہ بار اسی سنت کونیہ کے ذریعے بے شمار لوگوں کو حق سے ہٹانے کے لیے انہیں فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں۔

اسی سنت کونیہ کے تحت رب تعالیٰ نے ایک عظیم اور محکم خود کار نظام تخلیق کیا ہے جو اس کائنات کو رب تعالیٰ کی مشیئت سے چلاتا ہے۔ بے شک رب تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں پیدا فرماتا ہے۔ اور اس نظام کو اپنے امر ''کن'' کے ذریعے بلاواسطہ چلاتا ہے۔ اسی طرح اس نظام کو اپنی سنن کونیہ کے ذریعے یا پھر خود کار نظام کے ذریعے جس کو اس نے خود پیدا فرمایا ہے، چلاتا ہے۔

رب تعالیٰ کی سنن کونیہ قوت کے اعتبار سے مختلف اور تاثیر کی شمولیت کے اعتبار سے متفاوت ہیں۔ پس آگ کی معین وضع یہ ہے کہ یہ پانی کو بخارات میں بدل دیتی ہے لیکن جب پانی زیادہ ہو اور اسے آگ پر انڈیلا جائے تو وہ (بجائے بخارات میں تبدیل ہونے کے خود) آگ کو بجھا دیتا ہے۔اور باوجودیکہ حرارت اور اس کے مآخذ بے حد اہمیت کے مالک ہیں لیکن رب تعالیٰ نے پانی کو زندگی کا قوام اور ریڑھ کی ہڈی بنایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (الانبیاء: ۳۰)

''اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔''

سنن کونیہ کو ہم آٹو میٹک گھڑی کی مثال سے واضح کرتے ہیں جسے چلانے کے لیے نہ تو ہمیں کوئی چابی دینی پڑتی ہے اور نہ کوئی سیل وغیرہ ہی اس میں ڈالنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی چلتی رہتی ہے اور صحیح وقت بتلاتی رہتی ہے۔ یہ خود کار گھڑی کا نظام دراصل دو گراریوں سے مل کر چلتا ہے۔ وہ یوں کہ جب ایک گراری کی حرکت بتدریج ختم ہوتی جاتی ہے، دوسری گراری

کھنچتی چلی جاتی ہے اور جب پہلی گراری کی حرکت رُک جاتی ہے تو دوسری گراری کی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ پس ایک گراری کی حرکت کا بتدریج ختم ہونا یہ دوسری گراری کے کسنے کا سبب ہوتا ہے۔ یوں دونوں گراریاں خود کار طریق سے باری باری یہ عمل دہراتی ہیں جس سے ایک خود کار نظام حرکت وجود میں آتا ہے۔ یوں ایک گراری کی حرکت ختم ہوئی اور دوسری کی شروع ہوتی ہے۔ جس سے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں ایک ترتیب سے حرکت کرتی ہیں اور تاریخ اور دن کی علامتیں بھی تبدیل ہوتی ہیں۔ یوں ہمیں کسی خارجی یا اندرونی طاقت یا عمل کے بغیر ایک خود کار نظام حرکت حاصل ہوتا ہے۔

غرض جب آپ یہ جانتے ہیں کہ خود کار گھڑی گراریوں کی متبادل حرکت سے وقت کی سوئیوں کو حرکت دیتی ہے تو جب آپ گھنٹے کی سوئی کو ایک پر دیکھتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ کچھ دیر بعد یہی سوئی "2" پر ہوگی۔ یعنی آپ کو گھڑی کی خود کار حرکت سے مستقبل کی ایک بات کا قدرے اندازہ اور ادراک ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جب گھڑی بن جاتی ہے تو خود بنانے والے کو اس کی حرکت پر غلبہ واختیار باقی نہیں رہتا کہ اب وہ گھڑی کی خود کار حرکت کو روکنا بھی چاہے تو روک نہیں سکتا۔ لیکن اس کائنات کے خالق کا، جس کا نظام رب کی قدرت سے خود کار ہے اس کائنات پر اختیار اس کے بنا لینے اور اس کو حرکت میں لے آنے کے بعد بھی ابد الآباد تک باقی ہے۔ وہ جب چاہے اس پورے نظام کو روک دے اور جب چاہے اس نظام کو ختم بھی کر دے۔

جی ہاں! رب تعالیٰ نے اس کائنات کو بھی پیدا کیا ہے اور اس میں انسان اور اس کے افعال کو بھی پیدا کیا ہے۔ اس کائنات کے خود کار نظامِ حرکت کے جال کو بھی بنایا ہے۔ لہٰذا بقولِ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ "جب افعال کا فاعل خود مخلوق ہے تو اس کے افعال کا مخلوق ہونا بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔" [1] یعنی انسان کا محاسبہ اس معنیٰ میں نہیں ہوگا کہ وہ ان افعال کا فاعل ہے کہ وہ ان کے عدم سے وجود میں آنے کا ذریعہ ہے۔ بلکہ انسان کے افعال پر اس کا محاسبہ

[1] ابو حنيفه، ص: ٤٥.

بایں معنی ہو گا کہ اس نے افعال کو عدم سے وجود میں لاتے وقت کن حتمی نتائج کے مالک اسباب کو اختیار کیا ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس مثال سے سمجھئے کہ ایک استاد ایک امتحانی پرچہ تیار کرتا ہے۔ جس میں متعدد سوالات پوچھے گئے ہوں۔ پھر ہر سوال کے متعدد جوابات بھی اس نے پرچے میں لکھ دیے ہوں جن میں سے کسی بھی ایک جواب کو چن لینے کا اختیار ہو۔ پھر وہ غور وفکر کے لیے اور متعدد جوابات کو ایک دوسرے سے ممیّز وممتاز کرنے کے لیے کافی وقت بھی دے دے اور صحیح جواب تلاش کرنے کے لیے اجتہاد کا بھی وقت دے اور ان جوابات میں سے کچھ بالکل غلط اور کچھ بالکل صحیح بھی ہوں۔

یہ استاد ہی ہے جس نے ان احتمالات پر مشتمل جوابات تیار کیے ہیں، اسے بعض جواب تو پسند ہیں اور بعض کو جائز قرار دیتا ہے جب کہ بعض جوابات اسے ناپسند ہیں۔ اب اگر اس نے درست جواب چنا تو انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ اور اگر غلط جواب چنا تو سزا ملے گی۔ [1] جب کہ استاد کسی ملامت کا سزا وار نہ ٹھہرے گا کیونکہ یہ سب اختیاری جوابات اسی نے تیار کیے ہیں، بلکہ وہ تو تعریف وستائش کا مستحق ہے کیونکہ اس نے نہایت عمدہ طریقہ اور مضبوط طرز کے ساتھ امتحان لیا۔ وہ یوں کہ اس نے صحیح جوابات بھی بتلا دیے اور غلط جوابات بھی۔

جب ہر بات اللہ کی مشیئت سے وقوع پذیر ہوتی ہے تو انسان کس بات کا جوابدہ ہے؟

رب تعالیٰ نے انسان کو اس قدر اختیار دیا ہے جس پر محاسبہ مرتب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کوئی کام اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (التکویر: ۲۹)

''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے۔''

تو پھر ایک مکلّف مخلوق کیونکر اپنے اختیارات کی جوابدہ ہوسکتی ہے؟ اور اس سے اپنے

[1] مجموع الفتاوی لابن تیمیة: ۸/ ۱۲۳.

اختیارات کا محاسبہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ انسان اور اس کی قدرتوں اور اختیارات کا خالق اللہ ہے اور انسان جن نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہی نے دی ہیں جن میں ہدایت، عقل اور حریت اختیار کی نعمتیں بھی شامل ہیں تو ہمیں یہ بات بھی تسلیم کر لینی چاہیے کہ وہ اللہ جب چاہے ہم سے یہ نعمتیں واپس بھی لے سکتا ہے۔ لیکن اگر اللہ انسان کو ان نعمتوں پر قادر بناتا ہے اور وہ ان کا غلط استعمال کرتا ہے تو محاسبہ اس غلط استعمال پر ہوگا۔

آیئے! اس مسئلہ کی گہرائی میں اُترنے کے لیے ہم ایک مثال بناتے ہیں:

''فرض کرو کہ تمہارا ایک چھوٹا بھائی ہو جو تمہاری باتیں اور تمہارے حکم سمجھتا ہو یعنی وہ عقل و تمیز رکھتا ہو اور تم اس کے سامنے ایک تھالی میں کھانے کی چیز بھی رکھ دو اور اس کے ساتھ گندگی اور جراثیم میں لتھڑا ایک کھلونا بھی رکھ دو۔ پھر تم اسے یہ سمجھاؤ کہ کھانے کی چیز مفید اور صحت افزا ہے جب کہ جراثیم میں لتھڑا کھلونا مضر صحت ہے۔ لہٰذا اگر وہ کھلونے سے کھیلے گا تو اسے جراثیم لگ جائیں گے اور وہ بیمار پڑ جائے گا۔ (یہ تمہارا سمجھانا اور فہماش کرنا ہے) پھر تم اسے ایک موقعہ دو کہ وہ دونوں میں سے جس چیز کو چاہے اختیار کر لے (یہ حریت اختیار ہے) تم اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھتے بھی رہو۔ وہ تمہارے زیر تسلط بھی ہے اور تم اسے جب چاہو اس کھلونے کے پاس جانے سے روک بھی سکتے ہو اور تم اس کی مصلحت کی خاطر اسے کھانا اختیار کرنے پر مجبور بھی کر سکتے ہو لہٰذا جب وہ محض اپنے اختیار سے جراثیم سے آلودہ کھلونا اُٹھائے گا تو وہ اس اختیار کے نتیجہ کا جوابدہ بھی ہوگا۔

جب انسان تقدیر کے لکھے کے خلاف چل ہی نہیں سکتا تو اس کا محاسبہ کیونکر کیا جاتا ہے؟

متعدد نصوص میں ''قدر'' یعنی تقدیر کا لفظ اس کے مشتقات اور اس کے مترادفات وارد ہوئے ہیں۔ انہی میں سے ایک معنی وہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے جنابِ جبریل علیہ السلام کے

ایمان کے بارے میں کیے جانے والے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، روزِ آخرت پر اور اس بات پر ایمان لائے کہ اچھی بُری تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے۔''[1]

عموماً ''قدر'' کے لفظ کے دو مدلول ہوتے ہیں:

(۱) قضاء یا امر تکوینی

(۲) ایک شے کے واقع ہونے کی تحدید اور رب تعالیٰ کے علم مطلق کے مطابق واقع میں جاری ہونے والی کسی چیز کا لکھ لینا۔

جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے ''لیکن رب تعالیٰ نے اس چیز کو وصف کے ساتھ لکھا ہے (کہ یہ بات یوں ہوگی) تا کہ حکم کے ساتھ (کہ یہ بات میرے حکم کی بنا پر واقع ہو گی)[2] یعنی رب تعالیٰ نے اپنے بندے پر یہ حکم جاری نہیں کیا کہ وہ فلاں فلاں کام ضرور کرے۔ بلکہ رب تعالیٰ نے اس چیز کے وصف کو ازل سے اپنے اس علم کے ذریعے جو زمان و مکان کی قید سے ماوراء اور مخلوق کے محدود حواس سے بالاتر ہے، لکھ لیا ہے کہ عنقریب فلاں بات یوں یوں ہوگی۔ اور فلاں مخلوق فلاں فلاں کام کو کرے گی۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ مخلوق کا علم زمانے کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی مخلوق اشیاء کا چھوٹے چھوٹے اجزاء میں ادراک کرتی ہے، مثلاً اگر مخلوق ایک چھوٹے ورق کی شکل کا ادراک کرنا چاہے تو ایک تو اسے ایک زمانہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ دوسرے اس ٹکڑے کی مستقل صورت بنانے کی احتیاج ہوگی۔

ہم مخلوق کے علم کو چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔ وہ علم جو ماضی میں یعنی گزرے ہوئے زمانے میں حاصل ہوا تھا۔ یہ علم ہر وقت نسیان اور بگاڑ کی زد میں رہتا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان۔

[2] ابو حنیفہ، الفقہ، ص: ۳۹.

۲۔ وہ علم جسے وہ زمانہ حال میں حاصل کرتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ واضح ہوتا ہے اور کبھی وہ بذاتِ خود معلوم بھی ہوتا ہے۔ جیسے امتحانی نتائج کہ وہ اعلان ہونے سے قبل بھی استاد کو معلوم ہوتے ہیں جب کہ اسی وقت وہ نتائج طالب علم کے اعتبار سے غائب ہوتے ہیں۔

۳۔ وہ علم جسے وہ کسی چیز کے بارے میں جو مستقبل میں وجود میں آئے گی، مستقبل میں حاصل کرے گی، اور جب تک زمانۂ مستقبل حاضر میں یا واقعہ میں تبدیل نہیں ہو جاتا، وہ علم ''غیب'' میں رہے گا۔

۴۔ مختلف اشیاء کے مجموعے سے پیدا ہونے والے تخیلات جن کے وجود میں آنے کا احتمال ہو، اور وہ بھی تب جب ان کے وجود میں آنے کی شرائط پائی جائیں۔

جب کہ رب تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے ہر شے حاضر اور موجود اور واقع ہے۔ رب تعالیٰ کے علم میں ماضی یا مستقبل یا متحمل نام کی کوئی چیز نہیں۔

اور یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ مخلوق کا علم مکان کی قید کے ساتھ بھی مقید ہے۔ اور مکان کی قید خود مخلوق کے علم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ اونچی جگہ سے دیکھنے والا وہ نہیں دیکھ پاتا جو نیچی جگہ والا دیکھ پاتا ہے۔ اسی طرح ایک چیز جسے کوئی پہلے دیکھ لیتا ہے، وہ دوسرے کے علم کے اعتبار سے ''غیبی'' اور غیر موجود چیز ہے۔ اسی طرح چوراہے پر کھڑا ہونے والا جو کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے اسے چوراھے سے دُور ایک جانب کھڑا ہونے والا نہیں دیکھ پاتا یا اس طرح نہیں دیکھ پاتا۔ لہٰذا چوراہے پر کھڑے ہونے والے کے اعتبار سے بعض چیزیں علم محسوس کا درجہ رکھتی ہیں جب کہ ایک جانب ہٹ کر اور دُور کھڑے ہونے والے کے اعتبار سے وہی چیزیں اُمورِ غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔

جب کہ رب تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے مکان یا واقع کی قید کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہاں ایک شے کی وجہ سے دوسری شے غیب یا دُور نہیں۔ بلکہ علم الٰہی میں ہر چیز حاضر ہے اور اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ انسان کے حواس کا دائرہ ادراک محدود ہے۔ حتیٰ کہ بعض

حیوانات اور حشرات کے قوی اور حواس اس سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مثلاً یہ بات معروف ہے کہ بلی اندھیرے میں نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ اور دُور تک دیکھ لیتی ہے۔ اسی طرح کتے کے سونگھنے کی حس بے حد تیز ہوتی ہے۔

جب کہ رب تعالیٰ کا علم حواس کی قید سے ماورا ہے، وہ سننے والا، دیکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کی سب صفات مطلق کامل اور لامتناہی ہیں۔ رب تعالیٰ کا علم مطلق ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝﴾ (یونس: ٦١)

''اور تم جس حال میں ہوتے ہو یا قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی (اور) کام کرتے ہو جب اس میں مصروف ہوتے ہو ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں۔ اور تمہارے پروردگار نے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے یا بڑی مگر کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔''

پس تقدیر اس کائنات میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات کے بھی لکھ لینے کا نام ہے جو اللہ کے علم میں ہے اور اللہ کا علم زمان و مکان یا ادراک کے حواسِ محدودہ کی قید سے ماوراء ہے۔ اور یہ اوامر کونیہ نہیں جن کی مخالفت ممکن نہیں بلکہ یہ علم الٰہی کا وہ لکھا ہے جو غلط نہیں ہوگا۔ یہیں سے یہ عقیدہ حاصل ہوتا ہے کہ ''تقدیر کے لکھے کے آگے احتیاط بھی کام نہیں دیتی۔''

انسانی سطح پر اس کی مثال یہ ہے کہ تمہارے ایک دوست نے سفر پر روانہ ہونا ہے اور اس میں اس نے چند سرگرمیاں سرانجام دینی ہیں اور تم اس کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل ہی نہایت دقت اور باریک بینی کے ساتھ اس کے آئندہ کے سب پروگراموں کی معلومات اکٹھی

کر کے لکھ لیتے ہو پھر ویسے ویسے ہوتا چلا جاتا ہے جیسے جیسے تم نے لکھا تھا۔ تو کیا اب تم یہ بات کہہ سکتے ہو تم نے ان سب کاموں کے کرنے پر اسے مجبور کیا تھا؟

ایک مومن اس بات کا پکا ایمان رکھتا ہے کہ رب تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِO﴾ (فصلت : ٤٦)

''جو نیک کام کرے گا تو اپنے لیے اور جو بُرے کام کرے گا تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا۔ اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

بے شک یہ ارشادِ ربانی اپنی دلالت میں صریح اور ثبوت میں قطعی ہے۔ بسا اوقات قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ کے قاری کو ایسی آیات اور احادیث بھی پڑھنے کو ملیں گی جن سے بظاہر جبر کا معنیٰ سمجھ میں آتا ہے لیکن جب وہ ان آیات کا ان آیات سے موازنہ کرے گا تو اس کی حیرت جاتی رہے گی۔

محاسبہ کیا ہے؟ اور مکافات و عقوبات کی نوعیت کیا ہے؟

ایک مومن کا اس بات پر پختہ ایمان ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ نے مکلّف مخلوق کو بے پناہ قوتیں اور قیمتی نعمتیں دے رکھی ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ نعمتیں اور قوتیں دے کر اس سے اس بات کا جوابدہ بنایا ہے کہ وہ ان نعمتوں کا صحیح استعمال کرے اور ان سے صحیح فائدہ اُٹھائے اور ان کی قرار واقعی حفاظت کرے اور ان کو ضائع ہونے سے بچائے۔

طبعی بات ہے کہ ان بے پناہ نعمتوں پر مکافات اور عقوبات کا عمل مرتب ہوگا۔ جو آزمائش کے بعد ہوگا۔ پس یہ دنیاوی زندگی جس میں ہم جی رہے ہیں یہ آزمائش کا گھر ہے جب کہ اخروی زندگی بدلے کا گھر ہے اور نعمتیں اور آزمائشیں یہ مشکل اعمال ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان نعمتوں سے دنیا کا وقتی فائدہ بھی اُٹھائیں اور آخرت کا عظیم اور دائمی فائدہ بھی حاصل کریں۔ لہٰذا اگر انسان نے ان نعمتوں کو اچھے طریقے سے استعمال کیا اور انہیں

آخرت کے نفع کے لیے اپنے کام میں لایا اور ساتھ ہی ان نعمتوں کو اچھے طریقے سے استعمال کیا اور انہیں آخرت کے نفع کے لیے اپنے کام میں لایا اور ساتھ ہی ان نعمتوں سے اپنا دنیا کا حصہ نہ بھولا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے تو اسے بدلے میں عظیم نعمتیں ملیں گی اور اگر وہ آزمائشوں پر حکم الٰہی کے مطابق صبر کرے گا تو اس پر بھی اسے نعمتیں اور نیکیاں ملیں گی۔

اس آزمائش کی سختی اس وقت سامنے آتی ہے جب ان نعمتوں کا وقتی فائدہ ابھی نعمتوں کے متصادم ہو جاتا ہے کیونکہ وقتی نعمتوں کا حصول یہ شہوتوں اور غفلتوں میں گھرا ہوتا ہے جب کہ اخروی اور ابدی نعمتوں کا حصول یہ ناگواریوں سے گھرا ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''بے شک دوزخ کی آگ شہوتوں سے ڈھانپ دی گئی ہے اور جنت کو ناگواریوں میں ڈھانک دیا گیا ہے۔'' [1]

مکلّف مخلوق پر کبھی یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کی دائمی نعمتیں پانے کے لیے دنیا کی وقتی، عارضی اور ناپائیدار نعمتوں کو قربان کر دے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی شہوتوں پر غلبہ پائے۔ اور ناگواریوں پر صبر کرے تاکہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو۔ بے شک یہ دنیا رب تعالیٰ کے نزدیک ایک بدبودار بکری کے مردار بچے یا مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں۔ [2]

انسان پر لازم ہے کہ کڑوے حق اور اس کے معدودے چند داعیوں کے درمیان اور لذیذ و شیریں باطل او اس کے بے شمار اعوان و انصار کے درمیان فرق کرے۔ اور انسان کو چاہیے کہ وہ ابلیس اور جن و انس میں سے اس کے ان مددگاروں کی کوششوں کے سامنے ڈٹ جائے جو اسے گمراہ کر کے خسارہ پانے والوں میں سے بنانے کے لیے دن رات محنتیں کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ محاسبہ کی بنیاد انجام اور تکمیل پر نہیں۔ بلکہ ان کوششوں پر ہے جو ایک انسان اپنی امکان بھر قدرتوں کی روشنی میں کرتا ہے یا رب تعالیٰ نے اسے جو نعمتیں اور قدرتیں دے رکھی ہیں ان کی بنا پر وہ کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ مثلاً ایک انسان طویل عرصہ تک زندہ نہیں رہتا

[1] البخاری، کتاب الرقاق۔ [2] مسلم، کتاب الزھد والرقائق۔

اور جس ماحول میں وہ پرورش پاتا ہے وہ غیر اسلامی ہوتا ہے۔ پھر وہ اسلام لے آتا ہے اس کے باوجود اس کے لیے اس شخص کے ساتھ مقابلہ کا میدان کھلا ہے جو اس نے ایک اسلامی گھرانے میں آنکھ کھولی اور طویل عرصہ تک زندہ بھی رہا۔ اور اسے فطری اور موروثی مواقع بھی بہت زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں محنت کرنے میں ایک جیسا زور لگاتے ہیں تو نتیجہ دونوں کے حق میں برابر نکل سکتا ہے۔

بے شک چند فرقوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''زندگی'' اور عمر یہ امتحان کے محدود عرصہ کے ساتھ قوی مشابہت رکھتی ہے۔ وہ چند فرق یہ ہیں کہ طالب علم کو اس محدود مدت کا پتا ہوتا ہے جیسے آج کا پرچہ تین گھنٹے کا ہے اور یہ کہ اسے وقت ہونے سے پہلے پہلے پورا کرنا ہے۔ جب کہ دنیاوی زندگی کے امتحان کے اعتبار سے یہ محدود مدت (عمر) نا معلوم ہے۔ دوسرے انسان جب چاہے یہ امتحان پورا نہیں کر سکتا۔ اور اس کا پرچہ حل کر کے جمع نہیں کرا سکتا۔ اور شاید ایسا اس لیے ہے کہ یہ دنیاوی زندگی کا امتحان ابدی بدلے اور جزاء کا مستحق اور اہل ٹھہرے اور تا کہ یہ بے حد مختصر عمل آخرت کے ابدی ٹھکانے کی تحدید میں معین و مددگار ثابت ہو۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے ''بے شک بندہ جنت والوں کا عمل کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ اہل جہنم میں سے ہوتا ہے اور ایک آدمی اہل جہنم کا عمل کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے۔ بے شک اعمال کا اعتبار ان کے خاتمہ پر ہے۔''

بسا اوقات ایک انسان کو حدیث شریف کے اس مضمون پر اعتراض ہو جاتا ہے لیکن یہ اعتراض مندرجہ ذیل بشری مثال کو غور سے پڑھنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے:

فرض کرو کہ تم ایک استاد ہو اور تم ایک ایسے طالب علم کے امتحانی پرچے کو دیکھ رہے ہو جو شروع میں تو اچھے اور صحیح جوابات دیتا ہے لیکن آخر میں جا کر وہ تھک جاتا ہے اور غلط جواب دینے لگتا ہے تو کیا تم اس کو آخر میں دیے جانے والے غلط جوابات کے نمبر دو گے؟ اب اس بات کا سبب جو بھی رہا ہو تم اگر اس کو نمبر دو گے تو اس بنیاد پر دو گے کہ اس نے آخر میں جا کر صحیح جواب دیا ہے یا نہیں؟

کامیابی اور ناکامی کے درمیان حد فاصل کو اس ارشادِ باری تعالیٰ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِo﴾ (فصلت : ٤٦)

''جو نیک کام کرے گا تو اپنے لیے اور جو بُرے کام کرے گا تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا۔ اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

اور کامیابی کی مثال اس ارشاد میں نظر آتی ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِo﴾ (آل عمران: ١٨٥)

''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا تو جو شخص آتش جہنم سے دُور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا، وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔''

مخلوق کا محاسبہ کرنے میں رب تعالیٰ بے حد رحیم و کریم ہے۔ وہ مخلوق کو مہلت دیتا ہے اور توبہ کرنے، اور سیدھے رستے پر آ جانے کے بے شمار مواقع دیتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی ذات، صفات، الوہیت اور ربوبیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور وہ اسی حال مر بھی جاتا ہے تو وہ بندے کے بے شمار گناہ بخش بھی دیتا ہے۔ اور کبھی اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بھی بدل دیتا ہے لیکن کسی کے لیے اس بات کی ضمانت نہیں۔ اس لیے مکلّف مخلوق کو چاہیے کہ وہ جہنم سے بچنے کے لیے اور جنت کی ابدی کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرے، وہ یوں کہ رب تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل کرے اور اس کے نواہی سے اجتناب کرے اور اللہ کے پسندیدہ اعمال کی کثرت کرے۔

آخرت کا بدلہ اس اعتبار سے عظیم ہے کہ ہمارے اعمال آخرت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں پھر بھی ہمیں ان اعمال پر عظیم ثواب مل جاتا ہے اور منکروں کے آخرت کے

عذابات بھی عظیم ہیں جنھوں نے توبہ کے مواقع سے فائدہ اُٹھائے بغیر ان کو ضائع کر دیا۔

ایک حدیث قدسی میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، اور کسی کان نے سنا نہیں اور نہ کسی بندہ بشر کے دل پر ان کا خیال ہی گزرا ہے۔''

پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو یہ ارشادِ باری تعالیٰ پڑھ لو:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (السجده : ١٧)

''کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان کے اعمال کا صلہ جو وہ کرتے تھے۔'' [1]

جو شخص نجات کے سب مواقع ضائع کر دیتا ہے اور رب تعالیٰ کے ارشادات سے غافل رہتا ہے اور تنبیہ و تذکیر کے مواقع سے انجان بنا رہتا ہے اور ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتا اس کے حق میں آخرت کا عذاب بے حد سخت ہے اور اہل دوزخ میں سے سب سے کم درجے کا عذاب جسے دیا جائے گا، اسے آگ کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن سے اس کا دماغ کھولنے لگے گا۔ [2]

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کے عقوبات اور مکافات کے درجات میں عظیم تفاوت ہے تاکہ وہ مختلف درجات مکلّف مخلوق کی محنت اور کوتاہی کے اعتبار سے مختلف ہوتے رہیں۔

کیا جہادکا مطلب اسلام سے انکارکرنے والوں کے ساتھ قتال ہی ہے؟

یادرہے کہ یہ مفہوم کلمہ ''جَاهَدَ يُجَاهِدُ'' کے صحیح مدلول کے متعارض ہے۔ پس مجاہدہ

---

[1] البخاری، کتاب بدء الخلق ، باب ما جاء فی صفة الجنة.

[2] البخاری، کتاب الرقاق.

یہ ایک فعل سابق کا ردّ عمل ہے۔ جو بصورتِ دوام ہوتا ہے۔ یہ "قَاوَمَ یُقَاوِمُ" کی طرح فعل ہے کہ اس میں بھی ایک کے فعل کے نتیجہ میں دوسرے کا فعل بطورِ ردّ عمل کے ہوتا ہے اور بصورتِ دوام ہوتا ہے۔ یعنی جب بھی ایک فعل اس کا ردّ عمل بھی ضرور ہو گا۔ اور مجاہدہ کا ابتدائی معنی "هَاجَمَ یُهَاجِمُ" (دوسرے پر حملہ کرنا) نہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ '' قتال'' یہ دوسرے کے انکار کا ردّ عمل ہے۔ اور بابت میں اس بات پر اکتفاء کرلوں جس کی طرف میں نے اسے دعوت دی ہے (یعنی جس دین کی میں دوسروں کو دعوت دوں اور وہ انکار کر دیں تو ردّ عمل کے طور پر میرا اس کے ساتھ قتال کرنا کافی ہے) کہ یہ بات ربانی اور بشری دونوں کے انصاف کے متعارض ہے۔ اس بات کے خطا ہونے کو سمجھنے کے لیے اگر انسان خود کو اس کی جگہ رکھ کر دیکھے جس کو اس نے دعوت دی تھی تو کافی ہے۔ یہ فہم عقل و فطرت دونوں کے متعارض ہے۔ چنانچہ جب کوئی غیر مسلم مذہبی رہنما اسلام کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے کہ مسلمانوں کے کافروں کے کفر کی وجہ سے ان پر تلوار اُٹھائی تھی تو علمائے دین اور عامۃ الناس اس تہمت کا برجستہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تہمت غلط ہے اور اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ہم امتحانی پرچہ بنانے والے سے یہ پوچھیں کہ کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ نگران امتحانات طلباء کو صحیح جوابات لکھنے پر مجبور کرے؟ تو ہمارا فوراً حتمی اور منطقی جواب یہ ہوگا کہ ''نہیں''

اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ جہاد کی بابت یہ فہم خود متعدد قرآنی صریح اور قطعی الدلالت نصوص کے بھی متعارض ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرہ: ٢٥٦)

''دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت (صاف طور سے ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔''

لہٰذا محاسبہ ہو گا تو مرنے کے بعد اور آزمائش کا زمانہ گزرنے کے بعد۔

جہاد کا یہ مفہوم ان متعدد صریح آیات کے بھی خلاف ہے جو اس بات کو تاکید کے ساتھ

بتلاتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری فقط پہنچا دینا تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾

(الشوریٰ: ٤٨)

''پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تم کو ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارا کام تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے۔''

بلکہ رب تعالیٰ جناب رسول اللہ ﷺ پر اس بات پر عتاب فرما رہے ہیں وہ کافروں کے ایمان قبول نہ کرنے پر اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (یونس: ٩٩)

''اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین پر ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

ان مذکورہ آیات میں بیان کردہ حقائق قابل نسخ نہیں کیونکہ یہ وہ حقائق مطلقہ ہیں جن کو ہم نے رب تعالیٰ کی علام الغیوب ذات سے حاصل کیا ہے۔

اسی طرح جہاد کی بابت یہ مفہوم متعدد احادیث نبویہ کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ چند قیدیوں کو خدمت نبوی میں لایا گیا۔ اتنے میں ایک قیدی عورت قیدیوں میں کسی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

اچانک اس عورت نے قیدیوں میں ایک بچے کو پایا تو اس کو سینے سے لگا لیا اور اسے دودھ پلانے لگی۔ (یہ منظر دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا: ''تمہارا کیا گمان ہے کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے عرض کیا: اللہ کی قسم! نہیں یہ عورت اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے بچے کو جہنم میں نہ پھینکے۔''

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی بڑھ کر مہربان ہے۔“ [1]

اور جہادی یہ مفہوم جناب رسول اللہ ﷺ کی اس شدید تمنا کے بھی خلاف ہے کہ ساری انسانیت بلکہ ان کے بعد میں آنے والی نسلیں بھی ایمان لے آئیں۔ چنانچہ جب پہاڑوں کے فرشتے نے خدمت اقدس میں عرض کیا کہ ” اے محمد! اگر آپ ﷺ چاہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ان (بنوثقیف) کو کچل کر پیس ڈالوں“ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”نہیں بلکہ میں اس بات کی اُمید کرتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے ایسے لوگوں کو پیدا کرے جو اللہ اکیلے کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔“ [2]

پس جب رب تعالیٰ کی اپنے بندوں پر اس قدر رحمت ہے اور نبی کریم ﷺ کی یہ شدید تمنا تھی کہ لوگ حتیٰ کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی ایمان لے آئیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام ان لوگوں کے ساتھ قتال کرنے کا حکم دے جو اسلام قبول نہیں کرتے اور انہیں موت کے گھاٹ اُتار کر آئندہ اسلام لانے کا موقع بھی نہ دے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ طاقتور اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے عقائد ونظریات قبول کرنے پر مجبور کر دے۔ تو کیا رب تعالیٰ کی حکیم وعلیم ذات سے یہ بات ممکن ہے کہ وہ ایسا ملکی اور ریاستی قانون مقرر کرے جو طاقتوروں کے صلح جو کمزوروں پر مسلط ہونے کے شرعی جواز کو مہیا کرتا ہو تا کہ یہ طاقتور کمزوروں کو اپنے عقائد ونظریات تسلیم کرنے پر مجبور کرسکیں؟

كيا ولاء ميں نصرت اور محبت كا معني پايا جانا لازمي هے؟

یہ بات ملحوظ رہے کہ ”الولاء“ اور اس کے مشتقات کا اسامی مدلول وہ ایک طرف کی دوسری طرف ہر ایک نوع کی وصایت، حکم اور اختیار کا وجود ہے۔ اور ہم لفظ ”مولیٰ“ اور

[1] البخاری، کتاب الادب، باب من ترك حبيبة .

[2] البخاری، کتاب بدء الخلق۔

’’ولی‘‘ کا اطلاق ’’موصی علیہ‘‘ اور ’’وصی‘‘ دونوں پر کر سکتے ہیں۔ ❶

اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ’’ وَ لایہ‘‘ (واؤ کے زبر کے ساتھ) اور ’’وِلایہ‘‘ (واؤ کے زیر کے ساتھ) دونوں کا بنیادی معنی ایک ہی ہے۔ ❷

ولاء یا ولایت کے حالات کئی قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ جن میں سے چند اقسام کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ رب تعالیٰ کی اپنی ساری مخلوقات پر ولایت۔ کیونکہ وہ اس کائنات کے نظام کی تدبیر کرنے والا اور اپنے بندوں پر قوت والا ہے۔ جو بھی کسی دوسرے کو نفع یا نقصان دیتا ہے اللہ کے حکم سے ہی دیتا ہے یہ ولایت سیادت مطلقہ ہے جس کے ساتھ کبھی عنایت و رعایت بھی مل جاتی یہ مگر اس وقت سیاق کلام سیادت پر دلالت کرے۔

۲۔ وہ ولایت جو مخلوقات میں باہم رغبت و طاعت کی بنا پر پیدا ہو اور کبھی یہ متبادل یعنی دوطرفہ ہوتی ہے کہ اہر ایک دوسرے کا وصی ہوتا ہے اور کبھی محض ایک جانب سے ہوتی ہے۔

۳۔ وہ ولایت جو مخلوقات میں ایسے حالات کی بنا پر پیدا ہوتی ہے جو طرفین کے براہِ راست ارادہ سے خارج ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی یہ ولایت موروثی ہوتی ہے جیسے باپ اور بیٹے کے درمیان ولایت، اور کبھی یہ ولایت کسبی ہوتی ہے جیسے مذہبی اختلاف کے باوجود مسلمان خاوند اور اس کی غیر مسلم بیوی کے درمیان ولایت۔

رہا یہ قول کہ ولایت میں نصرت اور محبت کا معنی پایا جانا لازمی ہے تو یہ معنی اس ارشادِ باری تعالیٰ کے متعارض ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی

---

❶ لسان العرب لابن منظور، مادة ولی۔

❷ لسان العرب لابن منظور۔

يُهَاجِرُوْا وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌo﴾ (الانفال: ۷۲)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھارے لیے ان کی دوستی میں سے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔''

پس ولایت یہ مومنوں کے درمیان ایک حالت کے پائے جانے کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔ اس اعتبار سے کہ جس مسلم اقلیت نے اکثریت کی طرف ہجرت نہیں کی، اس اکثریت کو اس اقلیت پر کوئی مستقل ولایت حاصل نہیں۔ مگر اس کے باوجود اگر یہ اقلیت دین کے معاملے میں اس اکثریت سے کسی قسم کی مدد مانگتی ہے تو اس اکثریت پر اپنی شرائط کے ساتھ دین کے معاملے میں اس اقلیت کی مدد کرنا لازمی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ محبت اس ولایت کا اسامی جزء ہے تو معنی درست نہ ٹھہرے۔ کیونکہ محبت تو مسلمانوں کے درمیان ہر حال میں واجب ہے۔ پس ہجرت نہ کرنا اغلبیت و اکثریت کے لیے اس بات کی وجہ جواز بن سکتا ہے کہ اکثریت کو اقلیت پر کسی قسم کی ولایت و وصایت نہ رہے، لیکن مومنوں کے درمیان محبت اور نصرت کے اسقاط کی وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ البتہ نصرت کے لیے شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا واجب ہے۔ اور ہمارے اس بیان کردہ معنی کی تائید اس ارشادِ نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ عالی مقام ہے:

''ولاء اسی کی ہے جو آزاد کرے۔''[1]

---

[1] البخاری، کتاب العتق، باب من ملك من العرب۔

پس یہاں ولاء ایک کے دوسرے پر حق کی ضمانت کا نام ہے۔ جو دونوں کے یعنی دونوں فریق کے درمیان محبت اور نصرت کو واجب نہیں کرتی۔ جیسا کہ متعدد آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شفاعت، وقایت (حفاظت کرنا) ارشاد (نصیحت کرنا) اور عشرت (حسن معاشرت کرنا) کہ یہ تمام الفاظ ولایت کے اساسی مدلولات میں سے نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی یہ معانی ولایت کے معنی کی طرف مضاف ہو جاتے ہیں اور جو احادیث نبویہ میں غور وفکر کی نگاہ ڈالتا ہے، وہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ [1]

اس پر مستزاد یہ کہ بعض آیات کا سیاق بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے کہ حرام اور ممنوع ولایت صرف اہل اسلام کے ساتھ دوستی رکھنے تک محدود ہے (اور ان کے علاوہ کے ساتھ دوستی رکھنا حرام ہے) چنانچہ جو اسلام کے دشمن ہیں یا مسلمانوں کے ان کے دین کی وجہ سے دشمن ہیں ان کے ساتھ ولایت اور دوستی رکھنا حرام اور ممنوع ہے۔ جیسا کہ ولاء کے نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں خہ محبت کا ہر درجہ اور باہمی تعاون معدوم ہی ہو یا بغض ہی ہو کہ اسلام نے بعض مواقع پر غیر مسلموں کی تالیف قلب کی اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اس بات کی ترغیب دی ہے تا کہ مشترکہ مصالح دنیویہ حاصل ہوں۔ اسلام نے غیر مسلموں سے مدد لینے، ان کے علوم سے معاونت حاصل کرنے اور ان کی علمی و تکنیکی مہارتوں سے فائدہ اُٹھانے کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے استعانت کی کوئی سلبی اثر مرتب نہ ہو جو مسلمانوں کی آخرت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ [2]

کیا ''براء'' میں بغض و عداوت کا معنی پایا جانا لازمی ہے؟

لفظ ''البراء'' اور اس کے جملہ مشتقات کا اساسی معنی اور مدلول ''ایک شے سے جدا ہونا'' ہے۔ چاہے وہ شے تہمت یا عیب یا کوئی قرض ہو۔ یا اس لفظ کا اساسی معنی ''کسی اصل مختلف سے جدا ہونا'' ہے جیسا کہ لفظ ''اَبْـــدَعَ'' میں ہے۔ یا اس لفظ کا معنی زندہ مخلوقات (جیسے

---

[1] المعجم المفهرس لالفاظ الاحاديث النبوي: ۳۲۲/۷، ۳۲۵ (ازونسك) مادة" ولی"۔

[2] فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱۴/۴، ۱۱۶۔

انسان) اور معنوی شے (جیسے کفر) کے درمیان تعلق کی نفی ہے۔ یا اس لفظ کا معنی مخلوقات کی دو جماعتوں کے درمیان تعلق کی نفی ہے۔ [1]

ان بیان کردہ معانی کے تناظر میں دیکھ لیجیے کہ لفظ ''براء'' میں بالضرور اس شخص کے ساتھ بغض و عداوت رکھنے کا معنی شامل نہیں جو موجب براءت کوئی کام کرے۔

لفظ ''البراء'' میں اصل، اس شے کے ساتھ صلہ کی نفی اور اس کو ختم کرتا ہے جس کے براءت کی جاتی ہے۔ ہمارے بیان کردہ اس معنی کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

۱۔ درج ذیل مذکورہ آیت میں فقط اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ ہر فریق جو عمل کرتا ہے دوسرا اس سے بری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (یونس: ٤١)

''اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔''

۲۔ رب تعالیٰ نے عقیدہ اور عقیدہ والوں سے براءت کے درمیان فرق بیان کیا ہے اور کبھی دوسری براءت کو پہلی براءت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ﴾ (الممتحنة: ٤)

''یقیناً تمھارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے بری ہیں جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم تمھیں نہیں مانتے اور

---

[1] لسان العرب لابن منظور، مادۃ ''براء''۔

ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا۔‘‘

پس یہاں بتوں سے براءت کو ان کے پجاریوں سے براءت کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے کہ یہ دونوں مستقل اور الگ الگ اشیاء ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ کسی فعل سے براءت ہمیشہ اس کے فاعل سے براءت کو بھی مستلزم اور مقتضی ہو۔

۳۔ رب تعالیٰ نے بغض و عداوت کو ایک مستقل جملہ میں تبری (براءت) کی طرف منسوب کیا ہے اور بغض کو عداوت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ ان میں سے ہر ایک شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ یعنی ایک کا وجود دوسری باتوں کے وجود کو مستلزم و لازم نہیں۔ اور یہ معنی گزشتہ مذکورہ آیت کے تکملہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ﴾ (الممتحنه: ٤)

’’(اور) تمہارے (معبودوں کے) ہم (کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ ہم میں اور تم میں ہمیشہ کھلم کھلی عداوت اور دشمنی رہے گی۔‘‘

پس بغض کبھی مخفی رہتا ہے اور محسوس نہیں ہوتا اور نہ اس کا حسّی ترجمہ کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا ترجمہ سلبی عبارات اور سلبی سلوک کی ہیئت میں کیا جاتا ہے۔ پس وہ ظاہر ہو جاتا ہے تو اس وقت اسے عداوت کا نام دیا جاتا ہے کبھی معاندانہ اور دشمنانہ سلوک بغض کے بغیر بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس وقت یہ سلوک بطورِ مزاح کے یا تربیت کی غرض سے یا بغیر مقصد کے ہوتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات ملحوظ رہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اور اپنی قوم کے درمیان باہمی بغض و عداوت کا اعلان کیا تھا جس کی ابتداء خود قوم نے کی تھی۔ وہ یوں کہ انہوں نے محض سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو ٹھکرا دینے پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ وہ آپ علیہ السلام کے ساتھ بغض و عداوت پر اُتر آئے تھے۔ اسی لیے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس بغض و عداوت کے ختم

ہونے کو ایمان کے ساتھ مربوط کر دیا کہ اگر یہ ایمان لے آتے ہیں تو ان کے ساتھ عداوت اور دشمنی ختم۔لیکن اسی سورت کی ساتویں آیت اسباب کو کھلا چھوڑتی ہے ۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّجۡعَلَ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ عَادَيۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّوَدَّةً وَّاللّٰهُ قَدِيۡرٌ وَّاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝﴾ (الممتحنہ : ۷)

’’قریب ہے کہ اللہ تمھارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم ان میں سے دشمنی رکھتے ہو، دوستی پیدا کر دے اور اللہ بہت قدرت رکھنے والا ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا ،نہایت رحم والا ہے۔‘‘

وہ یوں کہ بغض و عداوت کی یہ حالت ختم ہوسکتی ہے اگر قوم اپنے بغض و عداوت سے باز آ جائے ۔ اسلام یہ دیکھتا ہے کہ دو مختلف طبقوں میں جو دین یا حق میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں، باہمی محبت و شفقت ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کو اس بات کا قائل کرنے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ حق پر ہے۔ اور اسلام دونوں کے درمیان کم از کم جس تعلق کو قبول کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریق پر امن تعلق قائم رکھیں، ہر فریق اپنے دین پر رہے۔ چنانچہ جب جنابِ رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب آپ ﷺ کی کوشش کے باوجود ایمان نہ لائے اور آپ ﷺ اس بات سے بے حد آزردہ خاطر ہوئے تو رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس افسردگی اور آزدگی پر ان لطیف لمحات کے ساتھ عتاب فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ۚ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ۝﴾ (القصص : ۵۶)

’’بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔‘‘

کبھی دو مختلف دین ولوں کے درمیان شعور فطری محبت ہوتا ہے جو غیر اختیاری ہوتی

ہے۔جس کی وجہ قرابت (والدین کے ساتھ) یا رحم (کتابیہ بیوی کے ساتھ) یا ایک دوسرے کے ساتھ احسان ہوسکتی ہے۔ (جیسے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کا آپ ﷺ پر احسان کرنا اور جیسے عدی بن مطعم کا آپ ﷺ پر احسان کرنا) اور کبھی محبت کا یہ شعور جانبین سے ہوتا ہے۔اگرچہ دوسرا فریق اپنی بدفہمی کی وجہ سے یا مسلمان مبلغ کوتاہی کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرے۔

گزشتہ عبارات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ولایت کے نہ ہونے سے براء یا بغض و عداوت کا ہونا لازمی نہیں۔ ولاء اور براء کے حالات متفاوت ہو سکتے ہیں۔لہٰذا ولاء یا براء کے نہ ہونے کی حالت میں بھی شفقت ومہربانی اور غیر جانبداری و کنارہ کشی ہوسکتی ہے۔

یہ جملہ بیان کردہ حقائق اس ارشادِ باری تعالیٰ کے موافق ہیں:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ o﴾ (الممتحنہ: ۸)

"اللہ تمھیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

رہا وہ شخص جو عداوت اور احسان کے جمع ہونے کے امکان کا قائل ہے وہ دراصل دو نقیضوں کو دشمنانہ سلوک اور احسان دونوں کو ایک وقت میں جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو ناممکنات میں سے ہے اور جو اس بات کا قائل ہے کہ اگر ایک مسلمان دل میں تو بغض رکھے جب کہ ظاہر میں سلوکِ احسان رکھے تو اسے ان دونوں نقیضوں کو جمع کرنے پر ثواب ملے گا تو دراصل وہ رب تعالیٰ پر اس بات کی تہمت دھر رہا ہے کہ رب تعالیٰ نفاق کو پسند فرماتے ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔نفاق تو ایسی مبغوض صفت ہے جس کو عقل سلیم اور فطرتِ سلیمہ کبھی قبول نہیں کرتے۔ اور اسلام تو خود دین فطرت ہے وہ عقل سلیم کے کبھی متعارض نہیں ہوسکتا۔

فصل سوم:

خیر پھیلانے کی حرص

عصر حاضر میں متعدد اعتقادی، فکری اور مذہبی جماعتیں ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ دنیا و آخرت کی سعادت اور کامیابی اُن کے منہج کو اپنانے میں ہے لیکن وہ خیر کے کاموں میں دوسروں کو شریک کرنے کا اہتمام نہیں کرتی، یہ جماعتیں دوسروں کو اپنے منہج کی دعوت نہیں دیتیں، بعض ایسی جماعتیں ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ اُن کا طریقہ کار دنیا میں انسانیت کے درد کا درماں ہے، اور عالمی امن وسلامتی کا ضامن ہے۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اُن کا منہج اور طریقہ کار پھیلنا چاہیے اور دوسروں کو اپنا لینا چاہیے۔ کچھ جماعتیں ایسی ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ جن نظریات پر ہماری جماعت کی بنیاد ہے یہی دنیا وآخرت کی فلاح وسعادت کی ضامن ہے، اور ہم ساری انسانیت کے خیر خواہ ہیں، چنانچہ ان نظریات وعقائد کی وجہ سے یہ جماعت اپنے منہج ونظریات کی طرف دعوت دینے میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہے، البتہ جبر واکراہ اور زبردستی سے گریز رکھتی ہے اور یہ جماعت مسلمانوں کی ہے۔

مسلمان اسلام کیوں پھیلانا چاہتے ہیں؟

مسلمان دنیا میں اسلام پھیلانا چاہتے ہیں کیونکہ اس بات کا حکم انہیں رب تعالیٰ نے دیا ہے کہ وہ دوسروں کو اسلام کی دعوت دیں۔ البتہ جبر واکراہ اور زبردستی نہ کریں، بلکہ رب تعالیٰ نے انہیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے کر انہیں اسلام لے آنے پر مطمئن کریں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ

بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ۝﴾ (النحل: ۱۲۵)

''آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلایئے اور (اگر بحث کا موقع آجائے تو) اُن کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں شدت اور خشونت نہ ہو)۔ جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے اوالے ہیں انہیں بھی خوب جانتا ہے۔''

اسی لیے مسلمان انسانیت کی سلامتی اور فلاح کے لیے بلکہ ساری مکلّف مخلوقات کی دنیا وآخرت کی فلاح وسلامتی کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اس بات کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ اسلام سب انسانوں کی خیر کا خواہاں ہے۔ اسلام مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ جن وانس کی سب مکلّف مخلوقات کی خیر وسلامتی کو چاہیں۔ اسلام نے مسلمانوں پر یہ حرام کیا ہے کہ وہ خدائی ہدایت (مراد اسلام) جیسی نعمت کے سلسلہ میں بخل کا رویہ اختیار کریں کیونکہ یہ نعمتِ اسلام انسان وجنات کی دنیا وی واخری نجات اور فلاح وسعادت کا ضامن ہے۔

اسی لیے اسلام نے اہل اسلام پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس ربانی ہدایت کو عام کریں تاکہ اس خیر سے کوئی بھی محروم نہ رہے۔

اسلام کی نظر میں ہر وہ شخص جو عاقل وبالغ ہے خواہ مرد ہو یا عورت اس کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے اعتقاد اور نظریات رکھے جیسے عقائد ونظریات رکھے گا ویسا ہی نتیجہ روزِ قیامت وہ پائے گا، اس لیے اللہ تعالی نے قرآن پاک میں ارشاد فرمادیا:

﴿لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ﴾ (البقرة: ۲۵۶)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت بلا شبہ ہدایت گمراہی سے ممتاز اور واضح ہوچکی ہے۔''

اور ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ﴾ (غافر: ۱۷)

''آج کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا آج کسی کے حق میں بے انصافی نہیں ہوگی۔''

بہر حال جب کوئی شخص اسلام کو برضا ورغبت قبول کرلے تو اب اس پر لازم ہے کہ اسلام نے جو فرائض وواجبات عائد کیے ہیں ان کو ادا کرے تاکہ اُن کے نہ کرنے پر جو عذاب رکھا گیا ہے اس سے نجات پائے، اور اِن فرائض و واجبات کے کرنے پر جو اجر وثواب رکھا گیا ہے وہ اسے حاصل ہو۔ جو شخص بھی اسلام قبول کرتا ہے اس کے ذمے ہے کہ وہ اسلام کی جملہ تعلیمات پر ایمان لے آئے اور جب تک اسلام کی تعلیمات اپنے ثبوت اور دلالت میں قطعی ہیں یا اس کے قریب قریب ہیں تو اس بات کی اجازت نہیں کہ کچھ باتیں اسلام کی مان لیں اور کچھ باتیں اسلام کی نہیں مانیں، قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ (البقرة: ۸۵)

''کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے بعض حصہ کا انکار کرتے ہو، پس تم میں سے ایسے شخص کے لیے اس کے علاوہ کیا سزا ہوگی کہ وہ دنیاوی زندگی میں اس کے لیے رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب ہوگا۔ اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان سے غافل نہیں۔''

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے اختیار سے کسی ملک کی شہریت حاصل کرلے تو گویا اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے لی کہ اب وہ اس ملک کا شہری ہونے کے اعتبار سے تمام شرائط کو پورا کرے گا۔ جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق اور مراعات کو حاصل کرنے کے لیے اپنے ذمہ تمام واجبات کو بھی ادا کرے گا۔ اور یہ نہیں کہ چند واجبات کو

جو پسند ہو ادا کرے گا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جس ملک کی اس نے شہریت اختیار کی ہے کبھی وہ ملک اسے دیس نکالا بھی دے دیتا ہے۔ مگر کوئی شخص کسی کو اسلام سے خارج نہیں کرسکتا ہاں یہ کہ کوئی خود ہی اپنے قصد وارادہ سے دائرۂ اسلام سے خارج ہوجائے۔ (والعیاذ باللہ)

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوۃ ادا کرے اور اس معاشرے کو اپنی خدمات سے مستفید کرے جس میں رہ رہا ہے تاکہ اس کی زکوٰۃ اس معاشرے کی مصالح عامہ کے کام آئے۔ البتہ وہ شخص جو اسلامی حکومت میں رہتا ہے اور اس نے اسلام قبول نہیں کیا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ جزیہ ادا کرے جس طرح ایک مسلمان زکوۃ دیتا ہے آج کل اسے ٹیکس کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ایک غیر مسلم ملک میں رہنے والا مسلمان زمین کا ٹیکس، خرید وفروخت کا ٹیکس اور آمدنی ٹیکس (انکم ٹیکس) ادا کرتا ہے اور زکوۃ سے بھی اس کو مفر نہیں۔

دوسرے ادیان کی سرگرمیوں کی بابت اسلام کا موقف کیا ہے؟

مسلم حکومت یا بعض وہ حکومتیں جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں ایسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتیں جو کسی دوسرے مذہب یا اسلام مخالف افکار ونظریات کی دعوت اور اس کی اشاعت سے متعلق ہوں، اس کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں:

ا۔ ایک سبب یہ ہے کہ اس ملک کے تمام باشندوں نے یا ملک کی اکثریت نے اپنے لیے اسلام مذہب اختیار کرلیا ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرتے ہیں اور اپنی نظام زندگی کے لیے انھوں نے اسلامی شریعت کو منتخب کرلیا ہے جس کی روشنی میں وہ باہمی تعلقات اور غیروں سے تعلقات استوار کرتے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد درج ذیل ہیں:

ا...... ساری کائنات کے لیے ایک خالق (پیدا کرنے والا) تسلیم کرنا، جو ذات باری تعالی اللہ جل جلالہ ہیں۔ (لفظ اللہ عربی زبان میں معبود یعنی جس کی عبادت کی جائے کے معنی میں ہے اس لفظ کا نہ تثنیہ ہے اور نہ جمع بخلاف اس لفظ کے جو معانی دوسری زبانوں میں ہیں

اس میں لفظ تثنیہ اور جمع وغیرہ بھی آتا ہے)

۲......خالق یعنی پیدا کرنے والا ایک ہی ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

۳...... یہ خالق ایسی طاقت وقدرت کا مالک ہے کہ اس کو کسی واسطہ کی ضرورت نہیں جو مخلوق کی حاجات وضروریات کی خبریں اس کو دیتا رہے۔

۴...... اُس خالق جل جلالہ نے انسان وجنات کو کچھ ایسی صفات سے نوازا ہے جو دوسری مخلوقات میں نہیں ہیں: مثلاً: عقل ورشد، اچھے برے کا اختیار، فطرتِ سلیمہ اور حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی لائی ہوئی ہدایت ورہنمائی جیسی عظیم صفات جنات وانسانوں کی عطا کی گئیں ہیں، مگر یہ دونوں مخلوق یعنی جن وانس اس دنیا میں کیے ہوئے اچھے برے اعمال کی جزا یا سزا جنت یا دوزخ کی شکل میں آخرت میں پائیں گے۔

۵......مکلّف مخلوق یعنی جنات وانسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے آخری رسول حضرت محمد (ﷺ) پر جو احکامات نازل فرمائے ان کی اطاعت وفرماں برداری کرے۔

ان مذکورہ اسلام کے بنیادی عقائد و امور سے واضح ہوا کہ موجودہ ادیان اور فکری مذاہب اسلام کے ایک سے زائد بلکہ اکثر بنیادی عقائد سے متصادم ہیں، لہٰذا اسلام کے مخالف عقائد وافکار اگر ملک میں پھیلائے جائیں تو یقیناً اہل وطن اور باشندگانِ ملک کی نہ صرف یہ کہ دنیاوی زندگی خراب ہوگی بلکہ آخرت کی زندگی بھی اُن کی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

۲۔ دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ کسی بھی ملک کے سب باشندے بالغ نہیں ہوتے۔ بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سنِ رشد کو نہیں پہنچے ہوتے جن کے بارے میں یہ ضروری ہے کہ اُن کو ان باطل افکار ونظریات سے بچایا جائے جو ملک کے اکثر باشندوں کے عقائد کے مستصادم ہوتے ہیں البتہ جہاں انسان رہتا ہے وہ وہیں کے قوانین کا پاسدار ہوتا ہے چنانچہ اگر اسلامی ملک کا باشندہ کسی غیر اسلامی ملک میں ذاتی یا حکومتی نمائندہ بن کر جاتا ہے تو وہ بھی اُس ملک کے قوانین کی پاسداری کرتا ہے، رہا معاملہ علمی تحقیقات اور بحث کا تو اس سلسلہ میں اسلامی حکومتیں ہر مذہب کے سلسلہ معلومات اور ان کے عقائد

وافکار پڑھنے سمجھنے کے لیے تمام وسائل فراہم کرتی ہیں اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا، البتہ اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والا اور مطالعہ کرنے والا واقعتاً رسرچ اسکالر اور علم دین میں پختہ ہو تاکہ کھرے کھوٹے اور حق وباطل کی تمییز کر سکے۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ بین الاقوامی معاہدات ثقافتی حقوق کی روشنی میں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ باپ کو یا قانونی ولی ووارث کو اپنی اولاد یا ماتحت کی تربیت کا پورا پورا حق ہے کہ وہ جس نوعیت کی تربیت کرے اس کا کلی اختیار ہے۔ [1]

یہ بھی طبعی بات ہے کہ حکومت اپنی سیاسی حدود میں ایسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرے جو اس کی نظر میں خطرناک ہیں، اور جو اس کے داخلی امن وامان کے لیے سمِ قاتل ہیں جن سے اہل وطن کے امن وامان میں خلل واقع ہوگا، اگر یہ سرگرمیاں ملک کے ظاہری امن وامان اور لوگوں کی دنیاوی زندگی کو متاثر کریں تب بھی نہ صرف یہ کہ اسلامی ممالک بلکہ دنیا کا ہر ملک خواہ جمہوریت یا سیکولرازم پر یقین رکھنے والا ملک ہی کیوں نہ ہو یقیناً ان سرگرمیوں پر پابندی عائد کرے گا، چہ جائیکہ یہ سرگرمیاں ملک کے باشندوں کے دنیاوی اور اخروی زندگی کو تباہ وبرباد کرنے والی ہوں تو بھلا کیوں نہ پر پابندی لگائی جائے گی؟

اسلامی ممالک کی یہ منحرف وباطل عقائد پر پابندی لگانا دوسروں کے لیے کسی نقصان کا باعث بھی نہیں، بلکہ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کے مبادی واصول کے موافق ہے جس میں اس کے ممبران ممالک کی آزادی تسلیم کی گئی ہے۔

اگرچہ اسلامی حکومت میں دوسرے ادیان ومذاہب اور غیر اسلامی افکار وعقائد کی اشاعت پر پابندی ہے مگر اس کے باوجود غالب اکثریت والے مسلم ممالک میں غیر مسلم باشندوں کو اس بات کی کھلی اجازت حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادات اور رسم

---

[1] المیثاق الدولی لحقوق الإنسان، دفعہ ٢٦: ٣،الاتفاقات الدولیہ بالحقوق الاقتصادیہ والاجتماعیہ والثقافیہ، ١٣: ٣.

ورواج ادا کر سکتے ہیں، اور وہ اپنی معاشرتی زندگی میں اپنے مذہب کی پیروی کر سکتے ہیں البتہ اپنی مذہبی رسومات کو ان حدود میں رہ کر ادا کرنا ہو گا جو اکثریتی مسلم معاشرہ کے عقائد و عبادات کے متصادم نہ ہوں۔سعودی عرب اس سلسلہ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس کواسلام میں وہ تقدس وحرمت حاصل ہے جوکسی دوسرے ملک کونہیں اس لیے یہاں کا معاملہ دیگر اسلامی ملکوں سے مختلف ہے۔

اسلام کامملکت میں دیگر مذاہب کی اعلانیہ سرگرمیوں کی بابت کیا موقف ہے؟

ا۔ کیا اقوام متحدہ یا اس کی ذیلی تنظیموں سے منسلک ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ حکومت یا کوئی قوم اپنے عقائد ونظریات سے دستبردار ہوجائے یا اپنی اُس متاعِ عزیز (دین ومذہب) کوخیر باد کہہ دے جو ملک یا قوم وملت کی اکثریت کی بنیاد ہے اور جس کو وہ اپنے ملک میں ہی نافذ کرتی ہے؟

اس کا جواب یقیناً نفی ہی میں ہوگا، اور یہ بات ایسی ہے کہ جس پر سارے مما لک عمل پیرا ہیں چاہے وہ جمہوری ہوں یا غیر جمہوری حتی کہ وہ سیکولر مما لک ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے منشور میں یہ بات لکھی ہے کہ اس کے اغراض ومقاصد میں سے یہ بات ہے کہ

> ’’قوموں کے درمیان تعلقات کی بنیادمحبت واخوت کے ساتھ باہمی احترام پر ہے، باہمی حقوق میں سب برابر ہیں، ہرایک کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی کا حق حاصل ہے۔‘‘ [1]

یہ منشور اقوام متحدہ کواس بات کا اختیارنہیں دیتا کہ وہ کسی بھی ملک کے داخلی امور میں دخل اندازی کرے، اوراس منشور میں ایسی کوئی بات ہے جوممبر مما لک سے اس بات کا تقاضا کرے کہ وہ اس کے حل کے لیے انہیں اقوامِ متحدہ میں پیش کریں۔تاہم یہ بات بھی واضح ہو کہ اقوام متحدہ کے مذکورہ دفعہ اقوام متحدہ کے منشور کی ساتویں فصل میں مذکور دفعہ سات(۷) کے خلاف ہے بھی نہیں ہے۔(اقوام متحدہ کے منشور کی فصل سات دفعہ دو کے شق سات میں

---

[1] میثاق الأمم المتحده : الفصل الأول ، دفعه اول ، فقره : ۲ .

ہے کہ اگر کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر ظلم وزیادتی کرے گا تو اقوام متحدہ اِس ظالم ملک کے خلاف ہر ممکنہ وسائل استعمال کرے گا تا کہ اس کو سزا دی جاسکے)۔

۲۔ کیا کسی جمہوری سیکولر یا قومی نظامِ حکومت میں اقلیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے عقائد وافکار اور نظریات اور رسوم ورواج کو اکثریت پر عائد کریں؟ یقیناً اس کا جواب بھی نفی میں ہی ہوگا۔

۳۔ کیا کسی قومی جمہوری یا سیکولر نظام میں غیر ملکیوں کے لیے اس کا حق ہے کہ وہ بھی ملکی باشندوں کی طرف الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں اور ووٹ دے سکتے ہیں۔اس لیے کہ وہ اپنے ملک میں ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں لہٰذا غیر ملک میں بھی اُن کا یہ حق باقی رہے گا، خواہ ان کا قیام بغرض تعلیم یا ملازمت یا سیاسی پناہ کے طور پر ہی کیوں نہ ہو...... یہ غیر ملکی باشندے کسی ملک میں جب داخل ہوتے ہیں تو اُس ملک کے سفارت خانہ کے ذریعہ اُن کو ایک معاہدہ کے تحت ملک میں داخل ہونے کے لیے ویزا دیا جاتا ہے، ویزہ لگنے کے بعد کسی کے لیے کسی نئی شرط کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، اِلا یہ کہ یا تو ویزا کی مدت ختم ہوجائے یا طرفین اپنے معاہدہ کو ختم کردیں۔

اس بات کا جواب یہ ہے کہ اجنبی یا غیر ملکی جب کسی ملک میں رہنے کے لیے داخل ہوتا ہے تو ایک معاہدہ کے تحت اس کو قیام کی اجازت ملتی ہے جو برضا ورغبت طے ہوتا ہے، اس معاہدہ پر دستخط سے پہلے ہر ایک کو معاہدہ تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار ہوتا ہے۔

نیز تمام مقامی قوانین شروط کے ضمن میں آجاتے ہیں جن کو ماننا ضروری ہے سوائے کسی استثنائی صورت کے جس کا ذکر معاہدہ میں تحریر ہو۔

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی غیر ملکی کے عقائد وافکار اور اس کے نظریات کسی ملک کے نظام اور وہاں کے قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہر حال اس کے لیے لازم ہے کہ باہمی معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد وہ جس غیر ملک میں رہتا ہے وہاں کے قوانین اور اس کے نظام کی پابندی کرے یہاں تک کے اس کے اور ملک

کے درمیان ہونے والا معاہدہ کی میعاد پوری ہو، اور یہی ساری دنیا میں مروج ہے اور اسی پر سارے ممالک میں عمل ہے حتی کے جمہوریت اور سیکولرازم پر یقین رکھنے والے ممالک میں بھی یہی طریقہ رائج ہے، اس مسئلہ پر کی بابت متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں مثلاً:

۱۔ جب کوئی اجنبی امریکہ میں پیدا ہوتا ہے تو وہ امریکہ میں امریکن پاسپورٹ کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔ بسا اوقات امریکن پاسپورٹ کی وجہ سے اسے اپنے ملک میں بعض مسائل پیش آتے ہیں۔ ہاں وہ اس بات میں آزاد ہے کہ وہ سرے سے امریکہ میں داخل ہی نہ ہو اور اس کو امریکی پاسپورٹ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

۲۔ ویزوں کی بھی متعدد اقسام ہیں جو جمہوری وغیر جمہوری تمام ہی ممالک میں معترف بہ ومعمول بہ ہیں، پس جو شخص جس ملک میں جس قسم کے ویزے سے داخل ہوا ہے اس کو چاہیے کہ جس چیز کے لیے ویزا اس کو ملا ہے اسی کام سے منسلک رہے مثلاً اگر تعلیم کا ویزا ہے تو تعلیم حاصل کرے اور کسی قسم کی ملازمت نہ کرے اور نہ کسی سیاسی کام میں حصہ لے، پس کوئی بھی غیر ملکی ویزے کے حصول سے پہلے مکمل آزادانہ طور پر اپنی ذاتی مصالح کی رعایت کرتے ہوئے اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ ویزا حاصل کرے یا نہ کرے، کیونکہ کوئی ملک کسی غیر ملکی کو زبردستی ویزے حاصل کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

۳۔ بہت سے مسلمان بعض غیر مسلم ممالک میں ایک ملکی باشندے کی طرح تو رہتے ہیں مگر اُن کو بہت سے اسلامی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، مثلاً وہ کسی قاتل عمد کو قصاص میں قتل نہیں کرسکتے، یا زانی اور بدکار کو زنا کی سزا نہیں دے سکتے وغیرہ وغیرہ۔

کیونکہ یہ احکامات ان علاقوں کی اکثریت کے اختیار کردہ قوانین کے مخالف ہوتے ہیں۔اور باوجود یہ کہ یہ قوانینِ اسلامی (قصاص،یا جنایات کی سزا وغیرہ) اسلامی تشریع کی اساسیات میں سے ہیں تاہم اسلام ایک عملی اور گنجائش والا دین ہے اس لیے ایسے ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو اس طرح کی حدود نافذ نہ کرنے کی گنجائش اسلام میں دی گئی ہے، اور اُن کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ صالح ونیک بن کر رہیں بلکہ غیروں کے لیے اچھا نمونہ

ثابت ہوں۔ [1]

جب یہ حال ہے اُس ملکی شخص کا جو کسی ملک میں اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے تو غیر ملکی بدرجہ اولیٰ اُس ملک کے قوانین کا اپنے کو پابند بنائے گا۔ جس میں وہ قیام پذیر ہے، ورنہ بصورت دیگر اس ملک سے اپنی اقامت ختم کردے، اس لیے ہر ایک غیر ملکی آزاد ہے کہ وہ مملکتِ سعودی عرب میں آنا چاہے تو آئے، یا نہ آنا چاہے تو نا آئے، مملکت سعودی عرب کسی کو آنے پر اور یہاں رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔

رہا سفارتی ڈپلومیسی اور سفارتی تعلقات تو وہ وقتاً فوقتاً ادلتے بدلتے رہتے ہیں، جس میں مذہب اور التزام مذہب کی کیفیات مختلف ہوتی رہتی ہیں۔

یہ بھی غیر منطقی بات ہے کہ غیر ملکیوں کو اُن کی اپنی عبادتگاہیں بنانے کی اجازت دی جائے جن میں وہ کھلے عام اپنے دینی شعائر ادا کریں، اس لیے کہ ہر جگہ کی ملکی ڈپلومیسی یہ ہے کہ وہاں کے مقامی قوانین اور نظام کی پاسداری کی جائے اور طرفی ڈپلومیسی دو ملکوں کے باہمی احترام کو متقاضی ہوتی ہے۔ اسی باہمی احترام میں سے ایک بات مقامی تنظیموں کا احترام کرنا ہے۔

سعودی عرب کی قوم نے اپنے لیے اسلام کو اعتقاد، عبادت، تشریع اور اخلاق کے اعتبار سے مذہب اور دین کے طور پر پسند کرلیا ہے۔ دین اسلام نے اس علاقہ کو جس پر یہ ملک آباد ہے بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے، مثلاً: اسلام کا حکم ہے کہ جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہ ہوں کیونکہ اس علاقہ میں اسلام کے دو اہم اور مقدس ترین مذہبی مراکز ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک ساری دنیا میں سب سے افضل ومقدس مقام رکھتے ہیں۔ [2]

یعنی جزیرۃ العرب میں دو مذہبوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ رسمی اور قانونی اعتبار سے کھلم کھلا ملک میں رائج ہوں، اسی لیے سعودی مملکت کے ذمہ داروں کو جو اس ملک کی مسلم قوم

---

[1] رابطة العالم الاسلامی ، المجمع الفقهی ، بیان مکه المکرمه.

[2] مؤطا الإمام مالكؒ: كتاب الجامع.

کی نمائندگی کررہے ہیں اس سلسلہ میں اس پہلو کو ہمیشہ مدنظر رکھنا ہوگا اور اُن کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہیں (کہ وہ دو مذہبوں کو قانونی اجازت دیں)۔

اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کو مکہ مکرمہ میں آنے کی اجازت نہ دی جائے جس کی طرف منہ کرکے ساری دنیا کے مسلمان اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں ، اور یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے کہ جس پر اعتراض کیا جائے کیونکہ جمہوری یا غیر جمہوری ساری دنیا میں حکومتی یا غیر حکومتی ، ذاتی یا عمومی یا خصوصی اداروں ومرکزوں اور شعبوں کے بے شمار مقامات پر بورڈوں پر یا پلیٹوں پر ، یا دروازوں پر یہ لکھا ہوتا ہے" غیر متعلقہ شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں" اور یہ پابندی خاص اسباب کے تحت ہوتی ہے ، مثل ، متعلقہ جگہ یا شعبہ کا امن وامان مقصود ہو، یا بلاوجہ کی پریشانی سے بچنے کے لیے ، یا کسی متبرک ومقدس مقام کی عظمت کی وجہ سے......جیسے مکہ مکرمہ کی عظمت وتقدس کہ اسلام وہاں ایسے شخص کو آنے کی اجازت نہیں جس نے اسلام کو قبول نہ کیا ہو...... وغیرہ وغیرہ جن کی بنا پر کسی غیر متعلقہ شخص کو ممنوعہ مقام پر آنے کی اجازت نہیں ہوتی ، اور غیر متعلقہ شخص کو اس کا احترام کرنا ضروری بھی ہوتا ہے ۔

نیز یہ معاملہ شخصی اور ذاتی امور کے ضمن میں بھی آتا ہے چنانچہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنے گھر آنے کی اجازت دے اور جس کو چاہے اجازت نہ دے، کوئی کسی پر جبر واکراہ نہیں کرسکتا کہ وہ کسی کو اپنے گھر آنے سے نہ روکے ، اور ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اپنے سلسلہ میں اپنے حالات اور موقع ومحل کے لحاظ سے جو چاہے قید یا پابندی لگائے ۔

فصل چہارم:

اسلام میں انسانی حقوق کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور ساری کائنات میں اس کو ایک امتیازی شان عطا فرمائی چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾

(الاسراء: ۷۰)

''اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت وتکریم بخشی، اور ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور عمدہ عمدہ چیزیں ان کو عطا کیں، اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔''

انسان کو اللہ رب العزت نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔ (جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت: ۳۰ میں ہے) اور انسان کو اس کی اجازت عطا فرمائی کہ وہ زمین کی اشیاء سے آزادانہ طور پر استفادہ کرے، اور ان کو دنیاوی یا اخروی منفعت کے لیے استعمال کرے، اس کے ساتھ ہی رب تعالیٰ نے انسان پر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ اس دنیا کو آباد کرے اور اس میں عدل کو قائم کرے۔

رب تعالیٰ نے سب انسانوں کو ایک اصل سے پیدا فرمایا ہے اور وہ ہے مٹی (جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت: ۵۹ میں مذکور ہے) پھر نسل انسانی کو ایک ماں باپ سے کثرت کے ساتھ خوب پھیلایا۔ (جیسا کہ سورہ نساء آیت: ا میں مذکور ہے) اس لیے نبی کریم ﷺ اس بات کی تاکید فرماتے ہیں کہ: کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر، یا کالے کو سرخ پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں سوائے تقوی کے، (فضیلت والا صرف متقی

ہے۔)(مسند احمد)

اس مساوات انسانی نے اُن تمام امتیازات کو پاش پاش کردیا ہے جن کا نعرہ مختلف طبقے اور قومیں ہر زمانہ میں لگاتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالی کے انسان پر فضل وکرم میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو عمدہ ترین شکل وصورت میں پیدا فرمایا (جیسا کہ سورہ تین آیت:۴ر میں مذکور ہے) اور والدین پر واجب فرمایا کہ بچہ کا اچھا سا نام رکھیں، اس کے آنے کی خوشی منائیں اور اس لیے عقیقہ کی سنت رکھی گئی تا کہ بچہ کی خوشی میں قربانی دے کر تقرب الی اللہ حاصل ہو، والدین پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ اولاد کی اچھی تربیت کریں تا کہ آئندہ چل کر یہ بچہ دنیا وآخرت میں فلاح پائے، اس کے علاوہ جس معاشرہ میں بچہ آنکھیں کھولے وہاں کے افراد پر بھی اس سے متعلق بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ [1]

اسلام میں عدل ومساوات کا مفہوم کیا ہے؟:

دین اسلام میں عدل اور برابری میں فرق رکھا گیا ہے، چنانچہ عدل کو مطلق رکھا گیا یعنی عدل ہر حال میں مطلوب ہے اور اس میں کوئی تقسیم نہیں، جب کہ مساوات مطلق بھی ہے اور نسبتی بھی۔لہٰذا مساوات یہ عدالت کے برابر نہ ہوگی مگر اس وقت جب یہ نسبتی ہو۔

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا فرمایا، اور بعض کو بعض پر فوقیت اور فضیلت عطا فرمائی، مثلاً کسی کو ذکاء وذہانت سے حظ وافر عطا فرمایا، اور کسی کو ذہانت کم درجہ دی گئی، کسی کو خوب دنیاوی ثروت ودولت سے نوازا، اور کسی کو متاع قلیل اور تھوڑی دنیا دینے پر اکتفا کیا اور کسی کو علم و اخلاق سے نوازا تا کہ ایک کے ذریعے دوسرے کی علمی، اخلاقی اور مالی تکمیل ہو۔ درحقیقت یہ عدل الٰہی کے عین مطابق ہے نا کہ عدل وانصاف کے منافی۔کیونکہ یہ کمی وزیادتی منجانب اللہ ہے جو مالک وخالق ہے اور کسی کے لیے کیا بہتر ہے وہ بخوبی واقف ہے۔

---

[1] تفصیلات کے لیے شیخ محیسن ناصر درویش چینی کی کتاب الإسلام والنشئة السياسية ص ۹۹۔۴۹۹ کا مطالعہ کریں۔

پس مطلق مساوات عدالت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ بلکہ مساوات کی بعض اقسام تو عدالت کے بھی منافی ہیں کیونکہ انسانوں میں مختلف درجات ہیں ، مثلاً مجتہد ومحنتی اور کاہل وسست طالب کے درمیان برابری کرنا غیر عقلی ہوگی ، اسی طرح ذکی وفطین اور ہوشیار کے درمیان اور غبی اور کند ذہن کے درمیان برابر کرنا غیر فطری کہلائے گی ، استاد اور شاگرد کے درمیان مساوات بے عقلی کہلائے گی ، اپنے خاندان اور دوسرے خاندان کو ایک خانہ میں رکھنا غیر مناسب ہوگا ، اہل وطن اور غیر اہل وطن میں برابری غیر منصفانہ ہوگی ، اسی لیے مقابلوں اور مسابقوں میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے ، اور ان کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ جو زیادہ حق دار ہے اس کو حق کے مطابق پہلے حق دیا جائے اور یہ کہ بعض بعض کی طاعت کریں اور ان کے کام آئیں۔ نیز یہ فطری چیز ہے جس پر کائنات کا نظام چل رہا ہے ، اگر یہ اونچ نیچ امیر غریب ، خادم ومخدوم ، کمزور وضعیف کا فرق دنیا میں قائم نہ ہوتا ، اور سب برابر کے ہی ہوتے تو دنیا کا نظام خراب ہوجاتا ،اور کوئی کسے کے کام نہ آتا اسی لیے دنیا میں مطلقاً مساوات اور برابری ممکن نہیں ، اور اس فطری نظام میں اسلامی اور غیر اسلامی سب ہی معاشرے یکساں ہیں۔

یہیں سے ایک بات ذہن میں رہے کہ محنت ومشقت اور ہنر مندی اور ترقی کے درجات بلند کر کے کوئی اپنے کو بہت آگے لیجانا چاہے تو اس شخص کے لیے راہیں کھلی ہیں ، ہاں کوئی خاندانی اور حسب ونسب کو بڑائی کا ذریعہ اور فخر کا وسیلہ بنائے تو ایسی بڑائی کے دروازے اسلام نے بند کر رکھے ہیں۔ نیز جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے اوپر اتنی ہی ذمہ داری بھی بڑی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر قدرت نے کسی کو زیادہ عقل سے نوازا ہے تو اس پر اپنی ذات اور معاشرے کے اعتبار سے ذمہ دری اور جوابدہی بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔اسی طرح جس کے پاس جتنا زیادہ مال ہوگا اتنی ہی اس پر ذمہ داری بڑی ہوگی۔

مذکورہ تفاصیل سے معلوم ہوا کہ مطلقاً مساوات عدل کے برابر نہیں۔ ہاں نسبی اور جزوی مساوات کا عدل کے مساوی ہونا ممکن ہے ، چنانچہ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کا حق دیا جائے جس کا وہ مستحق ہے اور جو اس کے حسب حال ہے ، لیکن بعض صفات کے حامل اور

اُن سے عاری یا خِلقی یا فطری طور پر جو انسانوں میں تفاوت وفرق ہے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے برابری کرنا غیر عقلی اور غیر فطری ہے، مثلاً مرد وعورت میں برابری کرنا، باپ بیٹے میں برابری کرنا، یا محنتی ومجتہد اور کاہل وسست میں برابری کرنا وغیرہ بالکل درست نہیں۔

اسلام میں مساواتِ عادلیہ میں محاسبہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جتنی صلاحیتیں کسی کو ودیعت کی گئی تھیں اس نے ان کی بابت محنت کتنی کی ہے۔ لہٰذا نیک کو نیکی کا پورا صلہ ملے، اور بدکو بدی کی پوری سزا ملے، اسی لیے اسلام کی نظر میں یہ دنیا پورا بدلہ ملنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ آخرت ہی میں پوری جزا وسزا مل سکتی ہے، اس لیے کہ دنیا میں ایک شخص بغیر کسی مشقت وجدو جہد اور عمل کے محض دوسروں کے تعاون سے خوب عیش وعشرت کی بہاریں حاصل کرسکتا ہے، یا کوئی شخص خوب جدو جہد اور محنت ومشقت کر کے قبل اس کے کہ وہ اپنی محنت کا صلہ پائے اس دنیا ہی سے وفات پا جاتا ہے، اسی طرح ظالم کو اپنے کیے کی سزا نہیں ملتی اور وہ کسی طرح سزا سے بچ جاتا ہے، یا کوئی مظلوم انصاف پائے بغیر ہی اس دنیا کو خیر باد کہہ جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں، جو اس بات کے متقاضی ہیں کہ کوئی جگہ ایسی ضرور ہو جہاں پر ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے، اسی لیے وہ دائمی اور اخروی زندگی ہی ایسی جگہ ہوسکتی ہے جہاں پر ہر ایک کا محاسبہ عدل وانصاف کے ساتھ ہوسکے، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ مل سکے، اور تمام مخلوقات کے درمیان منصفانہ وعادلانہ فیصلے ہوسکیں۔

اسلام میں آزادی کا مفہوم کیا ہے؟:

اسلام میں ایسی آزادی کا مفہوم وہ مطلق آزادی نہیں یا اس جیسی آزادی نہیں جس کی بازگشت ہم دورِ حاضر کے بے دین نعروں میں سنتے ہیں۔ اسلام اس بابت اپنا ایک خاص نظریہ رکھتا ہے، کیونکہ اسلام ایک واقعیت اور حقیقت پسند دین ہے جو ایک نظریہ کا حامل ہے۔ لہٰذا اسلام میں حریت کا تصور ایک نسبتی قضیہ اور مسئلہ ہے کیونکہ انسان کائنات کے اس عظیم خودکار نظام کا پابند ہے جو رب تعالیٰ کی مشیئت سے چل رہا ہے۔ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے امر ''کن'' سے وجود بخشا، جو کچھ اس میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اسی

طرح انسان اس کائنات کی سنن کونیہ اور خود کار نظاموں کا بھی پابند ہے۔ وہی ذات عالی ہر چیز کی تدبیر فرماتی ہے، اسی نے کائنات کی چیزوں کو مسخر فرمایا، یہاں ہونے والی ہر چیز اُسی مالک وخالق کے حکم کی پابند ہے، ہر چیز اس کے علم میں ہے، وہ ذات ہر چیز پر غالب ہے، کسی کو اللہ تعالی نے اس کا اختیار نہیں دیا کہ جس طرح چاہے آزادانہ من چاہی زندگی گزارے۔

البتہ اس سب کے باوجود رب تعالیٰ نے بندوں کو اس بات کا حکم نہیں دیا کہ وہ دنیاوی زندگی کو جس میں وہ جی رہے ہیں اسی کو اختیار کرلیں جیسا کہ بعض نے اسلام کے عقیدۂ تقدیر کو سمجھا ہے۔ تقدیر تو بندوں کے افعال کو ان کے ہونے سے پہلے لکھ لینے کا نام ہے جس کی بنیاد رب تعالیٰ کا علمِ مطلق ہے۔ جو نہ کسی زمانہ کے ساتھ خاص ہے اور نہ مکان کے ساتھ بلکہ سارے زمانوں کو شامل اور ہر جگہ کو حاوی ہے۔ [1]

انسان کی آزادی بھی اپنے خالق و مالک کے اعتبار سے جوابدہی کی قید کی پابند ہے جس نے اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر بے شمار مخلوقات کو اس کے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ یہ انسان دنیا میں براحت وآرام زندگی گزارے، اور آخرت میں بھی اس کو سرخروئی حاصل ہو۔ انسان کی مسئولیت بنیادی طور پر عقل اور ہدایت (تعلیماتِ ربانیہ) کی بنا پر ہے۔ اور حریت اختیار حتمی نتائج کے حامل اسباب کے درمیان ہے جن کو ہم سنن کونیہ کہہ سکتے ہیں جیسا کہ انسان اپنے اور دوسری مخلوقات کے اعتبار سے بھی جوابدہ ہے۔

انسان کو کائنات میں ہونے والے عام احوال وتغیرات سے کسی طرح مفر نہیں، ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ تعلیمات الٰہیہ سے ناآشنا ہو اور ارشاداتِ الٰہیہ سے نابلد ہو، اور اس ناواقفیت کا وبال یقیناً اسے آخرت میں نقصان کی صورت میں ملے گا۔ لہٰذا یہ حریت نہ تو مفت ملتی ہے اور نہ اس کی حفاظت ہی مفت ہے۔

مزید یہ کہ انسان پر بہت سی وہ حدود وقیود ہیں جو اس پر معاشرتی وسماجی اور خاندانی طور

[1] دیکھئے شیخ اسمعیل کی کتاب کشف الغيوم ص ٥-٦٥.

پر عائد ہیں، اسی طرح جہاں وہ رہتا ہے یا کام کرتا ہے وہاں کے اصول وقواعد وضوابط کا بھی یہ انسان مکلّف ہوتا ہے۔

جس طرح ایک فرد واحد جن اصول وضوابط کا مکلّف ہوتا ہے بالکل اسی طرح اقلیت اکثریت کے عائد کردہ عمومی اصول وضوابط کے تابع وماتحت ہوتی ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ملکی وعلاقائی جماعتیں اور تنظیمیں جس طرح اپنے ملک وعلاقہ میں بہت سی پابندیوں اور اصول وضوابط کے دائرہ میں رہتے ہوئے کام کرتی ہیں، اسی طرح ایک ملک عالمی تنظیم اور عالمی قوانین اور اصول وضوابط کا پابند ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ایک قسم کی پابندی ہے کہ انسان جب برضا ورغبت کسی معاملہ کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے یا کسی جماعت کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے تا کہ اس جماعت کا ایک رکن بن کر اس کی مراعات سے مستفید ہو تو اس کو اپنی ممبر شب کی مدت تک اس جماعت کے اصول وضوابط کی پابندی کرنا ہوتی ہے، یا پھر اس کو علیحدہ ہونا پڑتا ہے، اور اگر وہ جماعت یا متعلقہ معاملہ میں خلاف ورزی کرتا ہے تو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

بہر حال ان پابندیوں کے باوجود انسان بہت سے معاملات میں آزاد بھی ہے، مثلاً جس طرح وہ دنیا وآخرت کے سلسلہ میں اچھے برے کے اختیار کرنے میں آزاد ہے، اور اس کو کلی اختیار ہے، اسی طرح بعض دیگر متنوع ومختلف آزادیاں بھی اس کو میسر ہیں، جو بعض مقبول ہیں اور بعض غیر مقبول ہیں۔

فطری صفات کا یہ تنوع وتعدد انسانی معاشرہ کی فلاح کے لیے لازمی ہے، اور انسانی معاشرہ کی سعادت اسی میں ہے جس کے بغیر آگے بڑھنے کا وہ حوصلہ ماند پڑ جاتا ہے جس کی بدولت انسان اپنی رفاہیت اور فلاح و بہبود کے لیے قدرتی وسائل سے استفادہ کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ فطری فرق نہ ہو تو انسان اپنی ضروریات تک کو فراہم کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

طبقات کی اس اونچ نیچ میں ایک حکمت یہ بھی ہے تا کہ انسان ایک دوسرے کا تعارف حاصل کریں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (الحجرات : ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔''

یعنی قبیلوں اور خاندانوں اور قوموں میں بانٹنا تعارف و پہچان کے لیے بھی ضروری ہے، ہاں مقبولیت عنداللہ تو وہ صرف تقوی پر منحصر ہے، نہ کہ خاندان اور قومیت کی بنیاد پر۔

شہری آزادی سے کیا مراد ہے؟:

بعض مسلمانوں کی یہ گمان ہے کہ مغربی قانون آزادی رائے اور فکری حریت میں بہت اچھا ہے کہ انسان کو وہاں کے قوانین میں اس کی مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنی رائے اور فکر و خیال اور جذبات کا کھل کر اظہار کرسکتے ہیں۔

لیکن اگر ہم انھیں مسلمانوں سے یہ سوال کریں کہ کیا آپ اس فکری آزادی کے حق میں ہو جو مغرب میں ہے اور جس کی وجہ سے وہاں کا معاشرہ بری دلدل میں پھنس چکا ہے چاہے یہ آزادی ہمارے معاشرے کو بھی ان نتائج تک لے جائے جن تک آج مغربی معاشرے پہنچے ہوئے ہیں جن میں سرفہرست آخرت کی ابدی زندگی کی بربادی ہے؟ طبعی بات ہے کہ ان مسلمانوں کا جواب نفی میں ہوگا۔

اِن سادہ لوح مسلمانوں کے خیال میں فکری آزادی سے مراد اگر یہ ہے کہ بھلائی اور خیر کے کاموں کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے میں آزادی ہونی چاہیے تو اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو اس سلسلہ میں کسی دوسری قوم کی نقالی کی ضرورت نہیں، اس اہم فریضہ کا ہر مکلّف مسلمان ذمہ دار ہے اور یہ اس کا دینی فریضہ ہے جس سے کسی مسلمان کو مفر اور چھٹکارا

نہیں ، یہ دینی واجب اس کے ایمان اور عقیدہ کا جز ہے، البتہ اس واجب کی ادائیگی کے لیے اسلام میں اصول وضوابط ہیں جن کی روشنی میں یہ واجب ادا کیا جانا ضروری ہے، سب سے اہم اصول اور ضابطہ تو یہی ہے کہ کتاب وسنت اور جمہور علماء امت کے فہم کے اور ان کے منہج استنباط کے مخالف نہ ہو، اور یہ کہ اس انداز سے اس واجب کو ادا کیا جائے کہ اس سے ایک انسانی معاشرے کی اصلاح ، سدھار اور حفاظت ہو اور وہ طریقہ معاشرے کی اصلاح کا آلہ ثابت ہو۔ نیز یہ کہ حکمت ودانشمندی کے ساتھ احسن واچھے طریقہ پر ہو،اور یہ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کی قدرت رکھنے والے لوگ معاشرہ میں اس فریضہ کی ادائیگی میں سستی سے کام نہ لیں۔ چاہے ان کو تکالیف ہی کیوں نہ سہنی پڑیں۔ معاشرہ کے افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کی حوصلہ افزائی کریں اور اس فریضہ کو ترقی دینے کے لیے ماحول بنائیں ، اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائے گی کی ذمہ داری کسی ایک مخصوص طبقہ یا جماعت کے ساتھ خاص نہ ہو اور نہ کسی ایک طبقہ کو معصوم سمجھا جائے کہ وہی اس کو کرے اور دوسرے افراد یا طبقے نہ کریں اور فلاں جماعت وطبقہ کی ہی یہ ذمہ داری ہے دوسروں کی نہیں۔

مثلاً ایک خاندان کے سلسلہ میں یہ بات مناسب نہیں کہ باپ کے علم کے بغیر خاندان کی اصلاح اور اس کو انحراف سے بچانے کی سعی کی جائے کہ باپ اصل ہے، اس کے علم میں لائے بغیر خاندان کو مشورے دینا اور اپنی آراء بلاتردد پیش کرنا مناسب نہیں۔ باپ کے علم میں خاندان کی ہر بات ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ممکن ہے بہت سے وہ مشورے جو خاندان کو دیئے گئے ہیں غلط ہوں، یا وہ آراء ناپختہ ہوں ، یا وہ رائے مشورے جو خاندان کو دیئے گئے ہیں ایسے ہوں جو دائرۂ ادب سے خارج ہوں وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایک خاندان اور اس کے سربراہ کے لیے کسی وہمی دنیا میں زندگی گزارنے سے بدرجہا بہتر ہے جہاں ہر بات حسب منشا ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ واقعہ میں اندھیرے میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں ، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جہاں کوئی برائی نظر آئے ابتدا ہی اسے کافور کرنے کی

کوشش کرنی چاہیے ورنہ اگر اس میں لا پرواہی برتی گئی اور اس کو نظر انداز کیا گیا تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کینسر آہستہ آہستہ بغیر کسی احساس کے بڑھتا جاتا ہے اور پھر اس منزل پر پہنچ کر اس کا انکشاف ہوتا ہے جب اس کا علاج ممکن نہیں رہتا، اور اس کا علاج بے فائدہ ہوجاتا ہے، اس لیے ہر چھوٹے یا بڑے خاندان، اور طبقہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ابتداء ہی سے ہر برائی کی جڑ کو ختم کرنے کی کوشش کریں، اسی طرح معاشرہ کے افراد کی ذمہ داری ہے کہ جہاں برائی کو دیکھیں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کے آغاز ہی سے اسے ختم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ آئندہ چل کر وہ لاعلاج مرض نہ بن سکے۔

اسلام میں غلامی سے کیا مراد ہے؟:

جب اسلام آیا تو گزشتہ مذاہب اور معاصر حکومتوں میں غلامی کا نظام چلا آرہا تھا۔ [1]

اسلام آنے کے بعد بھی کچھ صدیوں تک غلامیت باقی رہی، اسلام نے اس نظامِ غلامیت کو کیوں باقی رکھا؟ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ جو چیز اس وقت کی دنیا میں رائج تھی، اسی کے مطابق معاملہ کیا گیا، تاکہ مسلمانوں کا موقف دشمنانِ اسلام کے سامنے کمزور نظر نہ آئے، ہماری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ غلام بنانے کے اُس دور میں بہت سے طریقے رائج تھے مگر اسلام نے صرف ایک طریقہ کو جائز قرار دیا اور بقیہ کو ناجائز۔ [2]

یہ شکل بھی صرف جائز کی حد تک باقی رکھی نا کہ اسلام نے اس حکم کو واجب قرار دیا تھا کہ لوگوں کو ضرور ہی غلام بنایا جائے، اور وہ جائز شکل جس کو اسلام نے برقرار رکھا یہ تھی کہ امام المسلمین یا اسلامی حکومت کو ہی اس کا اختیار ہوگا کہ کن قیدیوں کو غلام بنائے اور کن قیدیوں کو معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ چھوڑ کر انہیں آزاد کردے۔ [3]

---

[1] دیکھئے کتاب: الكتاب المقدس : سفر الثنية ٢٠، صموئيل الثانى ، ١٢ : ١٨ ـ ١٩ ، سفر الملوك : ٣، ايوب ١٩، ١٤ ـ ١٦ ، رسالة بطرس الاولى ٢ : ١٨ ، ٢٠ ـ ٢١.

[2] ابن تيميه ، مجموع فتاوى ج٣٢ : ٨٩.

[3] سورة محمد : ٣، ابن تيميه ، مجموع ج٣١ : ٣٨٠، ٣٨٢، ابن القيم ، زاد ج٥ / ٦٥ ـ ٦٦.

عالمی حالات بدلتے گئے اور اسلام انسانیت کو اپنی اس اصل جا پہنچایا جس میں باہمی بھائی چارے کی تاکید ہے نا کہ ایک دوسرے کو غلام بنانے کی ترغیب ہے۔

اسلام میں اصل یہ ہے کہ عبودیت، بندگی اور غلامی صرف اللہ کا حق ہے کہ بندہ اس کا غلام ہے، اور وہی تنہا مالک ہے سارے انسانوں کا، سب اسی کے غلام ہیں، اور انسانوں کا باہمی رشتہ یہ ہے کہ وہ سب برابر اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جن کے درمیان تفاضل اور بڑائی صرف تقوی کی بنیاد پر ہے، اور تقوی ایک کسبی صفت ہے، اور یہ ایسی صفت نہیں جس کی حتمی تعیین کسی انسان یا دوسری مخلوق کے بس میں ہو، نا ہی اس کو میراث کے ذریعہ یا کسی کو عطا کر کے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ (الحجرات : ۱۳)

اسی لیے اسلام نے اس بات کی ترغیب دی کہ غلاموں کے ساتھ حسن معاملہ کیا جائے، اور غلاموں کے مالکوں کو بتایا کہ آخر یہ بھی تمہاری ہی جنس سے ہیں اور تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں لہٰذا ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرنا تم پر فرض ہے، بلکہ اسلام نے غلاموں کا مقام اتنا بلند کیا کہ اُن کے نسب کو ولاء کے ذریعہ اُن کے آقاؤں و مالکوں سے جوڑ دیا، جس سے غلاموں کو عزت ملی اور ان کو نسب کے اعتبار سے تقویت ملی، جس کی بنیاد اتنی مضبوط ہوگئی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہی غلام اسی ولاء کی وجہ سے اپنے آقاؤں کے حکام بن گئے۔ [1]

اسلام نے آکر مروجہ غلامی کو بعینہ قبول نہیں کیا بلکہ کچھ ایسی استثنائی حالتیں تھیں جن میں اس کو باقی رکھا، کچھ حدود و قیود اور اصول وضوابط متعین کیے جن کے ذریعے غلام اور آقا کے درمیان توازن پیدا کیا، یہ تو اسلام کی وہ پہلی عملی صورت تھی جو ناگزیر تھی اور جو اُس وقت کے حالات کا تقاضا تھا لیکن حقیقت میں اسلام نے آکر غلامیت کو ختم کیا، ایسے قوانین وضع کیے کہ جس سے غلامیت ختم ہوجائے، اور اس کو ختم کرنے کے لیے اسلام میں ایسے اصول متعین کیے جن سے غلامیت کے ختم ہونے میں مدد ملے، چنانچہ بہت سے گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا، غلام کی مدد کرنے کو کارِثواب فرمادیا گیا، بلکہ مسلمانوں کے بیت المال

---

[1] محمد قطب، شبهات ص۳۳-۳۵.

اور زکوۃ کے مصارف میں غلام کا حصہ رکھا گیا، غلام آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی اور اس کے فضائل بتائے گئے، جو باندی اپنے سردار کی اولاد اس کی وفات کے بعد جنے، وہ آزاد قرار دی گئی وغیرہ وغیرہ ایسی تعلیمات دی گئیں اور ایسے اصول وقوانین وضع کیے گئے جن کی وجہ سے اسلام نے غلامیت کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

یہاں پر ایک بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا تو کفارہ میں صرف یہی ایک امر نہیں یعنی یہ کہ گناہ کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنے پر ہی موقوف نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی دوسری شکلیں بھی رکھی گئیں جیسے مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا روزے رکھنا وغیرہ کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ غلامی ہمیشہ باقی نہ رہے گی۔ اب اگر گناہوں کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنے پر رکھ دیا جاتا تو غلامیت ختم ہونے کے بعد کوئی شخص کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتا، اس لیے گناہ کے کئی دوسرے کفارے بھی رکھے گئے۔ ❶

سیاسی تنظیم واتحاد سے متعلق اسلام کا موقف کیا ہے؟:

کوئی بھی نظام دو بنیاد عناصر سے خالی نہیں ہوتا، ایک تو اس کے اصول وضوابط، اور دوسرے اس کی عملی شکل اور اس کی تنفیذ چنانچہ ٹھیک اس وقت جب اسلام نے معاشرتی یا سیاسی تنظیم وجماعتی نظام کے لیے (خواہ وہ خاص جماعتی اور تنظیموں کی شکل میں ہوں یا عام کمیٹیوں اور پارٹیوں کی صورت میں ہوں) اصول وضوابط مقرر کیے تو اس میں مسلمانوں کو خاص شکل اور تنظیمی جزئیات اور ان اصول وضوابط کی تنفیذ کے لیے کوئی محدد ومتعین شکل کا پابند نہیں بنایا، بلکہ یہ امور مسلمانوں کے ذمہ چھوڑ دیئے گئے کہ وہ حالات اور واقعات اور زمان ومکان کی ضرورت اور موضوعیت کے مطابق عملی شکل اور تنفیذی امور اختیار کریں۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے سیّدنا داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام اور سیّدنا سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام کے درمیان نبوت وحکومت کے توارث کو جائز قرار دیا جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھا۔ اور اس کو ان پر حرام قرار نہیں دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

❶ سورة المائدة: ٨٩/ سورة المجادلة ـ٣ـ٤.

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ﴾ (النمل : ۱٦)

''اور سلیمان داؤد کے قائم مقام ہوئے اور کہنے لگے کہ لوگو! ہمیں (اللہ کی طرف سے) جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہر چیز عطا فرمائی گئی ہے، بے شک یہ اس کا صریح فضل ہے۔''

پس اسلامی اصول ومبادی ہر زمان ومکان کے لیے موزوں ومناسب ہیں اور یہ اصول ومبادی انسان کے فطری اور بنیادی عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے خالق ومالک نے متعین کیے ہیں، اب ان اصول وضوابط اور قوانین اسلامیہ کی تنفیذ اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں جتنی عمدگی وسلیقہ مندی اور اچھی حکمت عملی اختیار کی جائے گی اتنے ہی اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے، چنانچہ اصول وضوابط اور قوانین کی پابندی کی سیاسی تنظیم اور معاشرتی امور میں دوسرے بہت سے مسائل وامور سے زیادہ ضرورت ہے۔

چنانچہ اسلام نے تنظیم پر زور دیا ہے اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ جماعت کا ایک امیر بھی ہو خواہ وہ جماعت دو افراد پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو۔ اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ نماز کو بھی باجماعت ادا کیا جائے۔ اور اگر وہ آدمی مل کر سفر کر رہے ہیں تو ان میں سے ایک دوسرے کا امیر ہو اسی طرح خود کو جماعت مسلمین کی طرف منسوب ہونے کی ترغیب دی ہے اور وحدتِ کلمہ پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران : ۱۰۳)

''اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑلو، اور آپس میں تفرقہ پیدا مت کرو۔''

اسلامی معاشرہ کے افراد کو اس ترغیب دی گئی کہ وہ باہم خیر کے امور ایک دوسرے کا تعاون کریں:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ (المائدہ : ۲)

''اور تقویٰ اور نیکی کے کام پر آپس میں تعاون کرو اور گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو۔''

اسلام میں یہی نہیں کہ مسلمانوں کو آپس میں تعاون پر ابھارا گیا ہو اور بس، بلکہ ایسے لوگوں کے سلسلہ میں بھی تعاون اور خیر سگالی کی تعلیم دی گئی جو دین و مذہب میں مختلف ہوں اس کی سب سے بڑی مثال اہل مدینہ اور یہودیوں کے درمیان ہونے والا وہ معاہدہ ہے جسے میثاقِ مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ [1]

اسلام اس بات کی بھی ترغیب دیتا ہے کہ آپس میں نیک برتاؤ کیا جائے چاہے دونوں کا مذہب جدا جدا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ٥﴾ (الممتحنه : ٨)

''اللہ نے اس بات سے منع نہیں فرمایا کہ تم اُن لوگوں سے بھلائی اور انصاف کا معاملہ کرو جنھوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں قتال نہیں کیا اور نہ تم کو تمہارے شہروں سے نکالا بلا شبہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔''

مبادیات کے اعتبار سے متعدد ایسی سیاسی نظام کی صورتیں ہیں جو اسلامی اور غیر اسلامی سیاسی نظاموں میں ایک جیسی ہیں۔ البتہ اسلامی سیاسی نظام کی متعدد ایسی صورتیں بھی ہیں جو ایک طرف مسیحی نظام دین سے مختلف ہیں اور جب کہ دوسری طرف لا دین ڈیموکریٹک نظام سے بھی مختلف ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند اہم فروق کو ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ وہ نظام جو مسیحی دور کے قرونِ وسطی سے تعلق رکھتا ہے غالب یہ ہے کہ وہ بشری نظام ہے مگر اس کو وتقدیس وعظمت کا لبادہ اڑھا دیا گیا ہے جو الٰہی اور خدائی قوانین کا حق ہوتا ہے، اور اس نظام کو مکمل تقدس کو درجہ دیا گیا، چنانچہ اس نظام میں حاکم اور سلطان کی

[1] ابن هشام ج٢/١٠٧ـ١٠٨ ، حميدالله ص٣٩ـ٤٧، العواص : ٥٠ـ٦٤.

حیثیت ایک تشریع ساز اور حاکمِ مطلق کی سی ہے، جبکہ اسلامی نظام میں حاکم اور محکوم دونوں ہی مکمل طور پر الٰہی اور خدائی شریعت کے ماتحت وتابعدار ہوتے ہیں، ہاں قانون کے تفصیلی جزئیات اور بعض نصوص کی نسبت خالقِ کون ومکان سے ہونے یا بعض نصوص کے فہم میں اختلاف کے وقت یا حالات کا جائزہ لینے یا کسی خاص حالت میں حکم نافذ کرنے میں کچھ جزوی اختیار حاکمِ وقت کو ہوتا ہے۔

۲۔ لادینی، جمہوری (ڈیموکریٹک) یا قومی نظام میں قانون سازی کا کلی اختیار اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے چاہے وہ اکثریت اور اغلبیت سچی بنیاد پر قائم ہو یا خانہ ساز ہو یا جھوٹ پر مبنی ہو۔ جس کا معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جب کہ اسلامی نظام میں اعتقادات ہوں یا عبادات، یا معاشرتی قوانین وتشریعات سب کے سب بلا واسطہ یا بلاواسطہ خالق جل مجدہ کے تابعِ فرمان ہوتے ہیں، سب کے سب قرآن کریم یا سنت نبویہ سے یا تو ماخوذ ہیں یا پھر قرآن وسنت کے ماہرین اور زندگی کے احوال وکوائف سے باخبر علماء عاملین کے نصوصِ شریعت سے استنباط شدہ مسائل ہوتے ہیں۔

☆......اسی طرح اسلام میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر ایک ایسا دینی فریضہ ہے جس سے کسی مسلمان کو چھٹکارہ نہیں اور ہم معاشرتی سطح پر اس عقیدہ وفریضہ سے دست بردار نہیں ہو سکتے، جبکہ ڈیموکریسی میں نقد وتنقید کی آزادی سے ایک انسان دستبردار ہوسکتا ہے۔

☆...... اسلام میں شوری کا نظام ایسا ہے جس میں صلاحیت اور استعداد پیش نظر رکھی جاتی ہے، یعنی رائے دینے کا حق اس کو ہے جو شریعت کا ماہر اور متعلقہ مسئلہ کے نشیب وفراز اور اس کے متعلقات سے خوب واقف ہو، اس میں مرد وعورت کی تفریق یا چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی نہیں روا رکھی گئی، کیونکہ اصل معیار رائے دینے والے کا ماہر شریعت ہونا اور مسئلہ متعلقہ کی اونچ نیچ سے خوب واقف ہونا ہے۔

بخلاف ڈیموکریسی یا قومیت کے نظام کے کہ اس میں قانون سازی یا قانون کی تنفیذ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کا اثر ورسوخ اور غلبہ ہوتا ہے اور اس بابت ووٹ بھی

دے سکتا ہے جو قانونی طور پر ووٹنگ کی اہلیت کی عمر کو پہنچ گیا ہو۔ خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو، اس کے اندر رائے دینے اور مشورہ دینے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو، وہ قانون سے واقف ہو یا نہ ہو، چنانچہ بسا اوقات قانون سازی اور قرارات کی تنفیذ اُن لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو مال ودولت اور ثروت والے ہوں، اور وہ لوگ کھلے طور پر یا پوشیدہ طور پر من مانے طریقہ پر قانون سازی یا قانون کی تنفیذ کرتے ہیں۔ (جمہوری نظام میں چونکہ حکومت کی مدت محدود ہوتی ہے اور اس نظام کی بنیاد یہ ہے کہ حاکم عوام کو جواب دہ تو ہوتا ہے البتہ خدائے واحد لا شریک لہ کے محاسبہ کا تصور نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس نظام میں آسانی کے ساتھ پیسے اور ذاتی اثر ورسوخ کے ذریعہ سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے اور شخصی مصالح کے لیے من مانی کی جاتی ہے)۔

☆...... اسلام میں ڈیموکریسی کے بعض ضابطوں کو سراہا گیا ہے مثلاً اپنے جذبات وخیالات کی آزادی، اور حریت تعبیر وغیرہ مگر اس شرط کے ساتھ کہ رائے کی یہ نام نہاد آزادی دائرہ اسلام سے خارج نہ ہو، اور نہ کسی کی دل شکنی ودل آزاری کا سبب ہو اور نہ اس میں دوسروں کی حق تلفی ہو۔

رائے کی آزادی سے واقعہ کی تشخیص اور اس کے نشیب وفراز معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے کہ بغیر صحیح تشخیص اور تحلیل وتجزیہ کے کسی معاملہ کا صحیح اور مناسب حل سامنے نہیں آ سکتا۔

☆...... اسلام نے رائے دہی اور شرعی اصولوں کی بنیاد پر انتخابات والیکشن کو تسلیم کیا ہے جب تک کہ وہ انتخابات قطعی طور پر نصوص اور اسلامی ثابت شدہ مسائل کے متصادم نہ ہوں اور نہ کسی واجب اور ثابت حرام کے مخالف ہوں لہٰذا انتخابات کے ذریعے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اسلام میں جمہوریت اور قومیت میں رائج اُن تمام وسائل اور طریقوں کو سراہا گیا ہے جن کی بنیاد مشورے اور اظہارِ رائے پر ہو اور جن سے قرار داد پاس کی جائے یا نظام ترتیب دیا جائے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کے قواعد اور شرعی

قوانین سے متصادم نہ ہواور مقصد یہ ہے کہ رائے دہی کے دائرہ کو بڑھایا جائے۔

☆...... دوسرے نکتہ نظر کے اعتبار سے سیکولر نظام کا پہلا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جو آگے بڑھ جائے اور غالب ہوجائے ، اور فتح پاجائے اسی کے ہاتھ میں طاقت وقوت ہوتی ہے، خواہ اس نے کامیابی حاصل کرنے میں اپنی ہوشیاری اور چالاکی استعمال کی ہو، یا بھاؤ تاؤ اورخریداری کی ذریعہ مال خرچ کر کے فتح حاصل کی ہو، اس نظام کی خامیوں میں سے یہ ہے کہ اس میں کسی کی پکڑ اور جوابدہی کا خدشہ برائے نام ہوتا ہے اور اگر مؤاخذہ کاامکان ہوتا بھی ہے تو وہ اپنے ہی جیسے انسانوں سے ہوتا ہے، جن کی رائے اورفکر کو آسانی بدلا جاسکتا ہے اورانہیں شیشے میں اُتارا جاسکتا ہے۔ نیز اس جمہوری اور سیکولر نظام میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ سیاسی غلبہ وقوت حاصل کرنے کے لیے ایسے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں جو جائز ودرست نہیں ہوتے، اور ذاتی مصلحت حاصل کرنے کے لیے قوم وملت کی مصالح کو قربان کردیا جاتا ہے، نیز قوم وملت سے دھوکہ دہی اور فریب کے ذریعہ اپنے شخصی مقاصد پورے کیے جاتے ہیں۔

جبکہ اسلام میں نظامِ حکومت کو لوگوں کی دنیاوآخرت کی سعادت وفلاح کا ایک وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز اس میں نگرانی اورنگہبانی صرف انسانوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالی رب العزت کی ذات عالی کو رقیب ونگراں تصور کیا جاتا ہے، اورمحاسبہ صرف دنیا میں لوگوں کے سامنے نہیں بلکہ آخرت میں پائی پائی کا حساب دیئے جانے کے عقیدہ کو ایمان کا جزء قرار دیا جاتا ہے، دنیاوی مؤاخذہ اورمحاسبہ میں اس کا قوی امکان ہوتا ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہ ملے مگر آخرت میں یہ تصور ممکن نہیں کہ اللہ تعالی کی ذات عالی تمام حقائق سے باخبر ہے۔ یہاں تک انسانی نگہبانی بھی تشریعاتِ ربانیہ سے متمدو ومستفید ہوتی ہے اور اس کا حال دوسرے ڈیموکریٹک اورقومی نظاموں جیسا نہیں ہوتا۔

وطنیت اور تعددِ مذاہب کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟:

اسلامی سیاست کی خشتِ اول مدینہ منورہ میں رکھی گئی۔ [1] اسلام کو اپنی سلامی سیاست کے روزِ اوّل ہی سے مختلف اجناس اور مختلف اقوام و مذاہب سے تعلق رکھنے والوں سے سابقہ پڑا، چنانچہ اس اسلامی حکومت کے نشاۃ اول ہی میں جن افراد سے واسطہ پڑا، مختلف اجناس مثل انصار ومہاجرین، یا یہودِ مدینہ سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ بت پرست مشرکین تک سے معاملات ومعاہدات طے پائے، چنانچہ اسلام میں ایک طرف جہاں افراد کے حقوق متعین وواضح کیے گئے وہیں جماعتوں کے حقوق بھی رکھے گئے، اور ہرایک کو اس کی مناسبت سے حقوق دیئے گئے چاہے وہ اکثریت میں تھے یا اقلیت میں۔ چنانچہ فرد کو وہ حق دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا اور جماعتوں اور اکثریت کو وہ حقوق دیئے گئے جن کے وہ مستحق تھے۔ کیونکہ امور عامہ جن میں تعدد متعذر رہے اکثریت کا حق راجح قرار دیا گیا اور اسلام کے فرد کے حقوق کو جماعت کے حقوق پر ترجیح دیتا ہے جب تک کہ اکثر افراد کے لیے وہ حقوق ضروری نہ ہوں۔

اسلامی ابتدائی دور میں ایک اصطلاح ''ذمی'' رائج تھی جس کا حقیقی مفہوم بعینہ آج وہی ہے جس کو موجودہ دور میں ''اقلیت'' کا نام دیا جاتا ہے، جس سے دورِ حاضر میں اہل وطن کی مختلف جماعتوں کے درمیان فرق قائم کیا جائے، ہاں ایک تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ ذمی کا اطلاق عہد اسلامی میں صرف اس فرد پر ہوتا تھا جو اسلامی حکومت میں دوسرے کسی دین کا پیرو ہوتا تھا، جبکہ موجود دور میں اس کا مفہوم کچھ وسیع ہے، چنانچہ ''اقلیت'' کا اطلاق اُن سب باشندوں پر ہوتا ہے جو کسی ملک کی اکثریت کے مقابلہ میں رنگ، یا نسل، یا زبان یا دین میں مختلف ہوں۔

اسلام میں اقلیت کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اُن کے حقوق متعین کیے گئے ہیں، مثلاً اقلیت اپنی زندگی کے ذاتی امور میں آزاد ہے، مثلاً وہ اپنے طور طریقوں کے مطابق عبادات کر سکتے ہیں، اسی طرح انہیں شہری اور معاشرتی حقوق میں بھی آزدی ہے مثلاً وہ نکاح ووراثت

[1] ابن هشام ج ۲/ ۱۰۷-۱۰۸.

اور عہد و معاہدے میں بھی اپنے دین و مذہب یا رسم و رواج کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور میں ایک غیر مسلم باشندہ پر جو جزیہ عائد کیا جاتا تھا اسے موجودہ دور میں ٹیکس کے تحت لے آیا جا سکتا ہے اور اس کی مقدار ایک واجبی سے تھی یعنی ۵% ، اور اس مقدار کا اگر ان ٹیکسوں سے موازنہ کیا جائے جو ٹیکس دورِ حاضر میں جمہوری وقومی حکومتوں نے عائد کر رکھے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جزیہ (ٹیکس) کی مقدار نہ کے برابر تھی ، اس میں بھی عورت ، بچہ ، بے عقل ، فقیر ، سن رسیدہ حضرات اور مریض وغیرہ کو جزیہ (ٹیکس) سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ [1]

اسلام میں اغلبیت کو جہاں بہت سے حقوق دیئے گئے ہیں وہیں اقلیت کے سلسلہ میں بھی ایسے حقوق متعین کیے گئے ہیں وہیں اسلام اقلیت کو حقوق دلوانے پر بھی حریص ہے۔ چنانچہ حضرت رسالت مآب کا ارشادِ گرامی ہے:

"خبردار! اگر کسی نے کسی ذمی یا معاہد پر ظلم کیا ، یا اس کی عزت پر حملہ کیا ، یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنایا ، یا اس کی دلی اجازت کے بغیر اس کی کوئی چیز لے لی تو میں روزِ قیامت اس (ذمی اور معاہد) کا مدافعت کرنے والا ہوں گا۔"

معاہد سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی پناہ حاصل کی ہو ، چاہے وہ کوئی غیر مسلم باشندہ ہو یا کوئی مقیم ہو۔ [2]

یہی وہ اسلامی اصول وقوانین تھے جو ایسے عدل وانصاف پر مبنی تھے کہ مڈل ایسٹ (شرق اوسط) میں صدیوں مسیحی اور یہودی اسلامی حکومتوں کے زیر سایہ آرام وسکون سے رہتے رہے ، اور اس کی زندہ مثال ہندوستان کی اسلامی حکومت ہے جو آٹھ صدیوں پر محیط ہے مگر کوئی ایک واقعہ بھی اس میں ایسا نہیں ملتا کہ مسلمانوں نے کسی باشندہ کو اسلام قبول

---

[1] دیکھئے: ابو یوسف ص ۱۲۹ـ۱۳۰ , صبینی حقیقة ص ٦٤ـ

[2] سنن ابوداود : الخراج ، اور دیکھئے العسقلانی ج۱۲/ ۲۷۰ـ۲۷۲.

کرنے پر مجبور کیا ہو، یہی وجہ تھی کہ صدیوں تک ہندوستانی ہندو اور مشرکین اقوام اپنے ہندو مذہب پر باقی رہے، دوسری جانب اسلامی لشکر اقصائے مشرق ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ تک نہیں پہنچ پائے اس کے باوجود وہاں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا۔ [1] یہی نہیں بلکہ یہودیوں کو جب مسیحیوں نے ظلم وستم ڈھاکر اسپین سے نکلنے پر مجبور کیا تو شمالی افریقہ میں اسلامی ممالک اُن کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئے۔ [2]

انسانی تعلقات کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

اسلام نے تمام مکلّف مخلوقات (مراد جنات وانسان) سب کو ہی ایسی بھلائی اور خیر کی دعوت دی ہے جو دنیا وآخرت کی کامیابی کو شامل ہے، حتیٰ کہ جولوگ اسلام سے اعراض کرتے ہیں اور اسلام کو قبول نہیں کرتے، بشرطیکہ وہ نہ تو اسلام کی مخالفت کرے نہ مسلمانوں پر ظلم، اور نا کسی ظلم کرنے والے کا ظلم میں ساتھ دے۔ اسلام نے ان کو بھی اخروی نجات کی دعوت دی ہے۔ ایسے غیر مسلم کے ساتھ اسلام کا حکم یہ ہے کہ اس کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ روا رکھا جائے اور مشترکہ مفادات میں باہمی تعاون کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ یہ معاملات ایک مسلمان کی آخرت کی فلاح و بہبودی سے متصادم نہ ہوں، اللہ تعالی نے انسانوں کے اندر باہمی تعاون کی فطری صفت ودیعت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝﴾ (الحجرات: ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ تم میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو زیادہ تقوی والا ہو۔ اور اللہ ہر بات

---

[1] Naik P_14

[2] المساری، الاعتذار عن الماضی.

جاننے والا اور ہر چیز سے خبردار ہے۔''

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کریمہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین تعلقات کی نوعیت کو اور زیادہ واضح کر کے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ٥ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥﴾ (الممتحنة : ٨۔٩)

''اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں، صرف اُن لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا بھی نہ ہو لیکن) تمہارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو تو جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں۔''

دوسرے الفاظ میں اسلام تمام مکلّف (جن وانس) مخلوق کو دنیا وآخرت میں سلامتی قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ [1]

اسلام نے ہر فرد کو اس بات کی تعلیم وترغیب دی ہے کہ اپنی سعادت کے لیے جدوجہد کرے، نیز کسی دوسرے کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی نہ کرے اور کوئی اس کی زندگی میں دخل اندازی نہ کرے۔ ہاں کسی کی اس کی رضا ورغبت کے ساتھ بلا جبر واکراہ اس کی سعادتِ دنیاویہ یا اخرویہ میں مدد کرنے میں کوئی برائی نہیں بلکہ یہ افضل ہے۔

[1] دیکھئے کتاب: حقيقة العلاقة ص/ ١١١۔١١٤ للصيني.

اور یہ اصول دو اہم حقیقتوں کی تاکید کرتا ہے:

۱۔ لوگوں میں ایک طرح کا اختلاف ہونا فطری امر ہے، جس کی علت بھی قرآن کریم میں بیان فرمادی گئی وہ یہ کہ باہم تعارف ہوسکے، ہاں افضلیت کا معیار وہ تو صرف تقوی پر منحصر ہے، اور تقوی حاصل ہونے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنے کی سعی کی جائے، اس طرح پر کہ اللہ تعالی کے احکامات کو بجالائے اور جن کاموں سے اللہ تعالی نے روکا ہے اُن سے رک جائے۔

۲۔ لوگوں کے درمیان بعض اختلاف ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ آپس میں مشترکہ امور میں باہم تعاون نہ کریں، بلکہ ضروری ہے کہ فطری اختلاف کے باوجود آپس میں تعاون کیا جائے، تاکہ مشترکہ جدوجہد سے دنیاوی سعادت سے ہمکنار ہوسکیں، اور آخرت کی ابدی زندگی کے لیے بھی کامیاب ہوسکے۔

یہ بات مبنی بر انصاف ہے کہ دین اسلام ایسے لوگوں کے درمیان فرق کرتا ہے جو اسلام قبول نہیں کرتے اور اہل اسلام کی مخالفت بھی نہیں کرتے، اور دوسرے وہ لوگ جو خود اسلام بھی قبول نہیں کرتے اور اہل اسلام کی مخالفت اور اُن سے عداوت ودشمنی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، پہلے قسم کے لوگوں کو اسلام میں اہل سِلم یا اہل صلح کہا جاتا ہے اور ان کے علاقوں کو دارالسلام کا نام دیا جاتا ہے۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کو اہل حرب اور اُن کو علاقہ کو دارالحرب کا نام دیا جاتا ہے، موجودہ دور میں اقوام متحدہ نامی تنظیم کے جو مما لک رکنیت رکھتے ہیں وہ بھی باہم اہل صلح ہیں سوائے ایسے چند استثناءات کے جن میں اقوام متحدہ کسی ملک پر بعض حالات میں کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔

پابندیاں لگانے کا یہ مسئلہ عموماً ملکی حالات و واقعات کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔ اسلام میں کسی پر پابندی عائد کرنے یا کسی سے صلح وجنگ کرنے کا اختیار کسی فرد واحد کو نہیں ہوتا، نہ کوئی جماعت یا تنظیم یا تنظیم کی ذیلی شاخ ہی اس کا اختیار رکھتی ہے بلکہ اس کا اختیار ولی امر اور حاکمِ وقت کو ہوتا ہے، اور حاکم وقت سے مراد وہ افراد ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ

ڈور ہوتی ہے، اس لیے کہ کوئی جماعت خواہ کتنی ہی مخلص ہومگر اس میں وہ جامعیت نہیں ہوسکتی جو اسلام میں مطلوب ہے، اور عموماً جماعتیں اور تنظیمیں کسی خاص نظریہ اور کسی خاص فکر پر مبنی ہوتی ہیں ،اس لیے ان میں وہ کمال اور جامعیت نہیں ہوتی جو ایک اسلامی ملک کو مطلوب ہوتی ہے، اسی لیے بعض تنظیمیں اور جماعتیں صحیح اسلامی نظریہ سے منحرف نظر آتی ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اِن تنظیموں کے ناعاقبت اندیشانہ رویہ کی بنا پر امت کو یا امت کے اکثر طبقہ کو عظیم خسارہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور بعد میں پھر سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور ایسا ہونا طبعی امر ہے اس لیے کہ کوئی جماعت یا تنظیم اگر نصوص شرعیہ کے فہم میں راہِ راست پر ہوتی بھی ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ حالاتِ حاضرہ کی صحیح تشخیص بھی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، جبکہ کسی معاملہ کے حل کے لیے ضروری ہے کہ نصوص شرعیہ کے صحیح فہم کے ساتھ حالات وواقعات کا تحلیل وتجزیہ بھی صحیح نہج پر ہو۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے غزوۂ احد کا واقعہ ایک روشن مثال رکھتا ہے، اسلامی غیرت مندی رکھنے والے اور اسلام کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے والے مسلم نوجوانوں بالخصوص اُن میں وہ صحابہ جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے اُن کی رائے یہ تھی کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا، جب کہ رسول اکرم ﷺ کی دوراندیش رائے یہ تھی کہ باہر نکلنے کی بجائے مدینہ میں رہتے ہوئے دشمنوں سے قتال کیا جائے ،ان نوجوان صحابہ کی نظر دینی جذبات اور غیرت مندی اور اسلام کے لیے قربانی دینے کے جذبہ پر مبنی تھی، جب کہ رسول اکرم ﷺ کی رائے عالی میں ایک ذمہ داری اور اسلام ومسلمانوں کے مستقبل کی فکر مندی اور ان کی سلامتی کی گہری فکرمندی نمایاں اور واضح تھی، لہٰذا دونوں رائیوں میں واضح فرق تھا۔

ہماری اوپر ذکر کردہ رائے سے کہیں کوئی یہ بات نہ اخذ کرلے کہ اسلامی حکومت کی ہر بات ہی صحیح فکر اور صحیح نہج پر مبنی ہوتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت کی بعض قراردادیں اور اس کے بعض فیصلے حکومت کے بعض بااثر افراد کی ذاتی مصلحت پسندی پر مبنی ہوتے ہیں

جس سے اسلام اور مسلم قوم وملت کو عظیم خسارہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔البتہ اکثر رائیوں میں دور رسی، شدتِ احتیاط اور بُرے انجام سے پہلے کی پیش بندی ملحوظ ہوتی ہے۔

مکالمات بین المذاہب کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

بعض اہل مذہب دوسرے مذہب والے افراد سے بات چیت کرنے سے خوف کھاتے ہیں اور اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ بین المذاہبی گفتگو ایک طرح سے اپنے مذہب سے دست برداری ہے۔حالانکہ یہ فکر وخیال درست نہیں،ہم یہاں پر اس مسئلہ کو ذرا وضاحت کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اور اس بین المذاہب بلکہ زیادہ صحیح تعبیر میں اہل مذاہب کے مابین بات چیت اور مکالمات کو چار قسموں میں بیان کرتے ہیں۔ [1]

۱۔ بین المذاہب بات چیت کی پہلی قسم یہ کہ بات چیت میں حصہ لینے والے تمام حاضرین کے مذاہب کو صحیح اور حق تسلیم کیا جائے،اس میں وہ مذاہب جو بذات خود دعوتی اور مذہب کی نشر واشاعت کا نظریہ رکھتے ہیں اُن کے نزدیک اس کا تسلیم کرنا ممکن نہیں جیسے کہ مسیحیت اور اسلام،اس قسم میں وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو دونوں مذہب والوں کی جانب سے مشترکہ طور پر بروئے کار لائی جاتی رہتی ہیں۔اگر چہ وہ کوششیں بلا ارادہ ہوں۔

۲۔ ان مذاہب کے مابین اختلاف کے باوجود اس نقطہ پر اہل مذاہب کا اتفاق کہ وہ ہر ایک کی سلامتی اور امن کے لیے آپس میں تعاون رکھیں گے،امن عامہ اور مشترکہ خیر کے امور میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے،چنانچہ اسلام نے اس معاملہ میں وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

۳۔ ہر اہل مذہب کی دوسرے اہل مذہب کو افہام وتفہیم کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کرنا کہ اس کا دین برحق ہے،اور جس دین پر وہ کاربند ہے وہی دنیا وآخرت کی سعادت کا ضامن ہے،اور اگر ہم حضرات انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوتی کوششوں کو بنظرِ غائر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دعوت کا پہلا قدم ہی افہام وتفہیم کی گفتگو کا یہ کا دروازہ

[1] الاسلام والحوار: صینی.

ہے، اور یہی وہ واجب ہے جس کو حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام نے ادا کیا اور ہر ایک داعیِ حق پر بھی یہی واجب و لازم ہے، چنانچہ بین المذاہب مکالمہ اور باہمی بات چیت اور افہام وتفہیم ایک ایسا طریقہ جس سے ہر ایک کو یہ سمجھنے سمجھانے کا موقع ملتا ہے کہ اس کا دین برحق ہے لیکن شرط ہے کہ اس گفتگو اور بات چیت میں محبت اور ذہنی صفائی ہونی چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بات چیت میں حصہ لینے والا ہر شخص دوسرے کی آراء وخیال وغیرہ کے سلسلہ میں کھلے ذہن سے غور وفکر کر سکے گا۔

۴۔ بین المذاہب مکالمہ تلقائیاً زبانی بات چیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات و امور میں مختلف اہلِ مذاہب کے مابین عملی گفتگو اور افہام وتفہیم کا تبادلہ ہو۔

انسانی حقوق سے متعلقہ تنظیموں کے سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق انسانی کی دعوی دار بہت سی تنظیمیں اور آرگنائزیشنز ہیں اسی طرح اُن کی منعقد کردہ کانفرنسیں یا اقوامِ متحدہ یا اس کی ذیلی تنظیمیں بعض قوموں یا پس ماندہ طبقات کی بہت سی قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہیں، یا بعض طبقات اور ستم رسیدہ اقوام کی مدافعت میں پیش پیش رہتی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ تنظیمیں ایسے سیاسی وقانونی مسائل بھی چھیڑ دیتی ہیں جو خود اقوامِ متحدہ کے اغراض ومقاصد سے متصادم ہوتے ہیں، مثلاً یہ تنظیمیں اپنے کو قومی اور ملکی قوانین سازی میں ایسا ثابت کرتی ہیں جس طرح یہ اُن کا قومی حق ہے اور گویا اُن کو ملک کی اکثریت نے چنا ہے۔

ان میں اکثر تنظیموں کی کارکردگی پر اور ان کی نیتوں پر ہمیں شک نہیں۔لیکن اُن کے اخلاص کے باوجود اُن کی جانب سے صادر ہونے والی قرار دادیں ایسی ہوتی ہیں جو قوموں کی دنیا وآخرت کی راہ میں دراڑ ڈالتی ہیں، اور اُن اقوام وطبقات کی آزادی میں رخنہ پیدا کرتی ہیں جنھوں نے برضا ورغبت اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ حقوق انسانی کی دعوی دار ان تنظیموں سے بعض مفاد پرست گروہ اور جماعتیں آکر تال میل کرکے

اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرتی ہیں اور اقوام وملکوں کے درمیان تعلقات کو خراب کرنے کا سبب بنتی ہیں ، اور اپنی شاطرانہ چالوں اور مکاریوں سے اقوام متحدہ کے اصول ومبادی کا سودا کرتی ہیں تا کہ اُن کے مفادات حاصل ہوں اور اُن کا ستارۂ اقبال بلند ہو، اور وہی طاقت وقوت کی مالک ہوجائیں۔

اسی وجہ سے چند سوالات اُبھر کے سامنے آتے ہیں:

۱۔ حقوق انسانی کی ان کی بنا پر حاصل علمبردار تنظیموں کے پاس یہ قوت وطاقت کہاں سے آئی کہ اقوام وطبقات پر اپنا تسلط جمائیں؟ کیا یہ طاقت وقوت اُن کو اکثریت کی بنا پر حاصل ہوئی ہے، یا الیکشن وانتخابات کے ذریعہ اُن کو یہ قوت میسر آئی ؟

۲۔ ان کی قراردوں کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر یہ تنظیمیں کسی قومی حکومت کی نمائندہ ہیں بھی تو کیا اِن کی قراردادیں قوم کی اُس اکثریت پر بھی حاوی وغالب ہیں جو حکومت کی نمائندگی کررہی ہے؟

۳۔ جب یہ تنظیمیں نہ تو الیکشن وانتخاب کے ذریعہ سے قوم کی نمائندگی کررہی ہیں اور نہ اُن کو کسی نے اس بات کا ذمہ دار بنایا ہے تو پھر آخر یہ کس قانون اور نظام کے تحت اقوام وطبقات کے داخلی امور میں دخل اندازی کرتی ہیں؟

☆...... کیا یہی اقوامِ متحدہ کے اصول ومبادی ہیں جن پر یہ چل رہے ہیں؟ اِن کا اُن ملکوں کے داخلی امور ومعاملات میں دخل دینا جو باضابطہ اقوامِ متحدہ کے ممبر ہیں، اقوامِ متحدہ کے اصول ومبادی سے کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے، اس لیے کہ اقوامِ متحدہ اپنے ممبروں کی آزادی کے معاہدہ کا پابند ہے۔ [1]

☆...... کیا یہ جمہوریت اور ڈیموکریسی کے اصول کے پابند ہیں؟ حقیقت میں تو ان کا عمل ڈیموکریسی کے اصولوں کو توڑتا نظر آتا ہے اس لیے کہ ڈیموکریسی میں قوت وطاقت اکثریت کے تابع ہوتی ہے۔

---

[1] دیکھئے: ميثاق الأمم المتحدة، فصل، المادة الأولى، الفقرة ٢، المادة الثانية، رقم ٧.

☆...... کیا یہ تنظیمیں واقعتاً انسانی حقوق کے اصول پر کاربند ہیں؟ حالانکہ اِن کی قراردیں اور یا جن قراردوں کی یہ تائید کرتی ہیں وہ اقوام وطبقات کے انسانی حقوق کو تارتار کرتی ہیں، اور بعض ملکوں میں نمائندہ اکثریت پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں۔

اس لیے ان تنظیموں کی قراردیں کسی قوم کے لیے لازم وواجب نہیں کیونکہ اِن سے منسلک افراد کسی قوم وملک کے نمائندہ نہیں ہوتے، لہٰذا ان کی قراردوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں، ہاں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بعض لوگوں کے نظریات وافکار ہیں۔

بہرحال اسلام اُن تمام کوششوں کا نہ صرف یہ کہ اعتراف کرتا ہے بلکہ ان کو سراہتا اور اُن کی ہمت افزائی کرتا ہے اور ان میں شرکت کی ترغیب دیتا ہے جو مظلوموں کے دفاع میں کی جائیں خواہ یہ مظلوم غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ [1]

اس لیے اگر یہ تنظیمیں واقعتاً مظلوم کی دادرسی کرتی ہیں، اور مظلوم کے دفاع میں قابل قدر خدمات انجام دیتی ہیں تو پھر اسلام اُن کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس قسم کے بعض حالات درج ذیل ہیں جن میں اسلام مظلوم کے ساتھ ہے:

۱۔ جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر ظلم کرے، خاص طور پر اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد۔

۲۔ جب کوئی ملک دوسرے ملکوں کی قوموں پر ظلم کرے، یا اپنے بعض باشندوں پر اپنے خود ساختہ قوانین یا بین الاقوامی قوانین کے سہارے ستم ڈھائے، دوسرے الفاظ میں جب کوئی حکومت وطن اور اہل وطن، یا اہل وطن کے مابین رنگ ونسل یا کسی دوسری عصبیت کی بنیاد پر ظلم وستم کرے بالخصوص اقوامِ متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد۔

۳۔ جب کسی ملک کی فوج کسی جگہ کے اصلی باشندوں سے ان کی جغرافیائی حدود کے اندر ان کی جائیدادیں اور زمینیں قبضہ میں لے لے۔

۴۔ جب کوئی حکومت بعض باشندوں کو اُن کے فطری حقوق سے محروم کرے، مثلاً اُن کو

---

[1] علاقة المسلمين : صينى ص ٦٤-٦٥.

ملک کے ذخائر کی آمدنی سے کچھ حصہ نہ دے، یا اُن کو تعلیم کے حق سے محروم کرے، یا جو پیشے وہ اختیار کر سکتے ہیں تاکہ ان کی گزران ہو ان کے اختیار کرنے سے انہیں روکے۔ یا اُن کو اُن کے علاقوں میں رہنے سے منع کردے جہاں وہ ملکی قوانین کے مطابق کوئی پیشہ اختیار کرسکیں۔ اور وہ لازمی ٹیکس بھی ادا کرسکیں۔ اور عمومی نظافت کا لحاظ رکھ سکیں۔ رہی وہ شرائط جن سے کسی کے عقیدہ اور رائے کی آزادی پر صرف آتا ہو یا وہ رنگ ونسل اور قوم قبیلہ کی شرائط پر مبنی ہوں تو اسلام ان کو بالکلیہ رد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

فصل پنجم:

اسلام میں عورت کا مقام

اسلامی تعلیمات اس انسانی فطرت کو فروغ دیتی ہیں جس پر اس کو اللہ تعالی نے پیدا فرمایا ہے، اللہ رب العزت والجلال نے لوگوں کو مرد وعورت کی شکل میں پیدا فرمایا تا کہ ان بنیادی میدانوں میں ایک طرح کی تخصیص پیدا ہو جائے جن سے استغناء ممکن نہیں۔ تا کہ پھر دونوں ایک دوسرے سے اپنی تکمیل کریں۔ اِن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دن ورات سے مل کر ایک دن بنتا ہے، اور ٹھنڈے اور گرم تار سے ملکر بجلی بنتی ہے جس کے ذریعہ پھر بہت سے جمادات میں زندگی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالی نے عورت کو ایک امتیازی صفت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے اندر جذباتیت ہے جو اس کی زندگی کے رہن سہن میں غالب ہے، مزید یہ کہ عورت خلقتاً جسم کی ایسی نرم ساخت رکھتی ہے جو معاشرہ میں مرد کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے میں رکاوٹ ہے، اسی طرح اُس کے اخلاق میں رقت ونرمی غالب ہے ،تا کہ عورت مرد کی حرات وگرمی کو اپنے اندر جذب کر سکے ،عورت کے اندر اللہ تعالی نے ایسی جاذبیت اور کشش بھی رکھی ہے کہ وہ مرد کے لیے نفسانی سکون فراہم کرتی ہے، اس کے غم اور پریشانی کو ہلکا کرتی ہے، اس کے دکھ درد کو دور کرتی ہے ،عورت کے اندر ایسی شفقت وحنونت ودیعت کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ بچوں کو پالتی ہے، اس طرح عورت کی ذات ایسی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں: وہ ایک کمزور ونرم مخلوق ہے جو دوسروں کی راحت کی خاطر اپنی ذات کو قربان کرتی ہے، یہ صفات جو عورت کو عطا کی گئی ہیں کسی بھی خاندان یا معاشرہ کی سعادت کے لیے ضروری ہیں علمی تجربات بھی یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ عورت کے اندر سخت نفسانی حالات برداشت کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ

ہے،اور سے مقابلہ کرنے کی بھر پور قدرت رکھتی ہے۔

دوسری جانب اللہ تعالی نے مرد کی خلقت کے اندر خشونت اور سختی رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ زمان ومکان کے وسیع دائرہ میں گھومنے پھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے،خوف وخطرہ کے مقامات پر وہ نفسیاتی صدمات ہمت وجواں مردی سے چلا جاتا ہے، اس باب میں وہ عورت سے فائق ہے، وہ ایسا باہمت ہے کہ وحشت کے مقام یا رات کے آخری پہر کی تاریکی میں بھی وہ بلا جھجک آتا جاتا ہے، اس کی جسمانی ساخت بھی عورت کی بہ نسبت زیادہ قوی اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، اور مرد عورت کے مقابلہ میں اپنی ذات کے دفاع پر پوری طرح قادر ہے۔لیکن مرد اور عورت کی امتیازی خصوصیات پر گفتگو کرنا ان استثنائی صورتوں کے منافی نہیں جہاں مرد عورت کے میدان میں اور عورت مرد کے میدان میں امتیازی شان کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتی ہے آئندہ مذکورہ گفتگو میں ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام نے متعدد امور میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو آج سے چودہ صدیاں قبل تسلیم کیا ہے۔رہے انسانی قوانین تو انہوں نے آج تک عورت کو اس کے بنیادی حقوق تک نہیں دیے چہ جائیکہ مرد کے برابر تسلیم کیا ہو، سوائے گزشتہ صدی کے۔ جب کہ اسلام کے دیے بعض حقوق تو عورت کو آج تک حاصل نہیں ہوئے۔ جیسے عورت کا مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا وغیرہ۔

عورت کا مرد کے مقابلہ میں کیا مرتبہ ومقام ہے؟:

اسلام میں عورت ومرد کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت ہے اس کے برخلاف بعض لوگ بعض نصوص شرعیہ سے ایسا مفہوم اخذ کرتے ہیں جو ان کی غلط فہمی کا سبب ہوتا ہے، یا نص شرعی کو اس سیاق وسباق سے ہٹا کر سمجھتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کا سمجھا ہوا نص کا مفہوم اسلام کے مسلمہ قواعد سے متصادم ہوتا ہے حالانکہ مرد اور عورت کا تعلق ایسا ہے جیسے دن کا رات سے تعلق ہوتا ہے، ایسی غلط فہمی کی ایک مثال درج ذیل ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ کیا کرو، میں نے دیکھا ہے کہ دوزخ میں اکثر عورتیں ہیں، عورتوں نے کہا، یہ کس وجہ سے یا رسول اللہ؟‘‘

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’تم عورتیں لعن طعن زیادہ کرتی ہو، اور شوہر کی نافرمانی کرتی ہو، میں نے عقل اور دین میں تم عورتوں سے زیادہ ناقص کسی کو نہیں دیکھا، تم میں سے بعض بہت زیادہ ہوشمند وعقل مند کو بھی بے عقل کر دیتی ہے۔ عورتوں نے پوچھا یا رسول اللہ! دین میں کس طرح ناقص ہیں؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’کیا ایک عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے آدھی نہیں ہے؟ عورتوں نے کہا: ’’ہاں یا رسول اللہ!‘‘

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’یہی تمہاری عقل کی کمی کی دلیل ہے۔‘‘

پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت کو حیض آتا ہے تو نہ وہ نماز پڑھتی ہے اور نہ وہ روزہ رکھتی ہے؟ عورتوں نے کہا: ہاں۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’یہ تمہارے دین کی کمی کی دلیل ہے۔‘‘ [1]

اب اس حدیث پاک کا سیاق وسباق سمجھئے، عید کا دن خوشی کا دن تھا رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو صدقہ کی ترغیب دی، جو خوش طبعی کے انداز میں تھی اور خوشی کے دن اس طرح کی خوش طبعی مناسب حال تھی، اور صدقہ کی ترغیب کے لیے اُن کے ایسے جذبات کو خوش طبعی کے انداز میں ابھارا جو اُن کی جزئیات سے متعلق تھے، مثلا یہ کہ اُن کی شہادت بعض امور میں

[1] صحيح بخاری كتاب الحيض.

آدمی کی نصف شہادت کے برابر ہے، اوران کو حالت حیض میں نماز معاف ہے جس کی قضا نہیں، یا خواتین کے لیے عذر کی وجہ سے روزے رکھنا موخر ہوجاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پھر یہ کہ یہ خوش طبعی اس انداز میں تھی اس میں ذم کے صیغہ میں تعریف بھی ہوگئی مثلاً فرمایا کہ تم ناقصات العقل والدین تو ہومگر ساتھ ہی ایسی ہوشیار اور سمجھدار بھی ہو کہ ہوشیاری سے بڑے سے بڑے بڑے عقلمند کو بے قوف بھی بنا دیتی ہواوراس کی عقل پر چھا جاتی ہو۔

رہا یہ کہ عورتیں جہنم میں مردوں سے زیادہ ہوں گی تو یہ ایک فطری بات ہے اس لیے کہ عورتوں کی تعداد مردوں کی بہ نسبت زیادہ ہی ہے، اس کے ساتھ اُن کے جہنم میں زیادہ ہونے کی دوسری وجوہات بھی ہیں، رہا شوہر کی ناشکری کا معاملہ تو یہ بھی انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے بالخصوص جذباتی انسان تمام خیر کو ذراسی دیر بھول جاتا ہےاوراس کا انکار کردیتا ہے۔

بہرحال اسلام میں مرد کے مقابلہ میں عورت کو جو مرتبہ ومقام دیا گیاہے اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ وہ حالات جن میں مرد وعورت برابر ہیں:

اسلام نے عورتوں کو شقائق الرجال فرمایا یعنی خواتین مردوں کے مثل ہیں، (جیسا کہ ترمذی کی روایت باب الطھارۃ میں ہے)، اسلام نے عورتوں کو مرد کا وارث اور مرد کو عورت کا وارث بنایا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبة: ۷۱)

”اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔“

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (النساء: ۳۲)

’’اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے، اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔‘‘

نیز ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾

(النحل: ۹۷)

’’جو کوئی شخص نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) اچھی زندگی عطا کریں گے، اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض اُن کا اجر دیں گے۔‘‘

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾ (الاحزاب: ۳۵)

’’بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد، اور ایمان والی عورتیں، اور فرماں برداری کرنے والے مرد، اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، اور روزہ رکھنے والے مرد، اور روزہ رکھنے والی عورتیں،

اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور کثرت سے ذکر کرنے والے مرد، اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اسلام میں حضرت آدم وحواء علیہما السلام کے جنت سے نکالے جانے میں آدھی ذمہ داری عورت پر رہی، تاہم بڑی ذمہ داری مرد پر ہی تھی اس لیے کہ آخری فیصلہ مرد ہی کے اختیار میں تھا۔ ❶

۲۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں عورت مرد سے ممتاز حیثیت اور زیادہ حق رکھتی ہے چنانچہ اسلام نے ماں کا حق باپ سے زیادہ رکھا ہے۔ ❷

مملکتِ سعودی عرب میں مثلاً سرکاری ملازمین کا نظام بچہ جننے والی عورت کو ۴۵ دن کی چھٹیاں دیتا ہے جن کی بنیاد وہ احادیث مبارکہ ہیں جن میں عورت کے نفاس کی مدت چالیس دن مقرر ہے۔ ❸

یہ چھٹی سالانہ چھٹی کے علاوہ ہے، عورت کے خاوند کی وفات پر عدت کی مدت کے مطابق یہ سرکاری نظام سو دن کی خصوصی چھٹی دیتا ہے، یہ چھٹی سالانہ چھٹی میں شامل نہیں ہوتی، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح کی چھوٹ مردوں کے لیے نہیں ہے۔

اسی طرح اسلام نے خواتین کو سونا اور ریشم وغیرہ پہننے کی اجازت دی ہے، مگر مردوں کے لیے یہ اجازت نہیں، اسی طرح خواتین کے لیے ہر مہینہ تقریباً ایک ہفتہ حیض کی وجہ سے نماز کو معاف کر دیا گیا اور بچہ کی ولادت کے بعد بھی اس کو ایک مہینہ سے زیادہ کی نمازیں معاف قرار دی گئیں، جب کہ مرد کے لیے ایک نماز بھی معاف نہیں۔

یہی نہیں مرد (یعنی لڑکے) کی پرورش میں وہ فضیلت وارد نہیں جو عورت (یعنی لڑکی) کی پرورش میں منقول ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

❶ دیکھئے: سورہ طه: الآية/ ١٢١. ❷ دیکھئے: بخاری باب الأدب.

❸ ترمذی: الطهارة.

''جس شخص کے تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ اُن کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ یقیناً جنت میں داخل ہوگا۔'' ❶

اسی طرح ارشادِ نبوی ہے:

''تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی گھر والی کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔'' ❷

اس طرح اسلام نے کسی کے اچھا اور بھلا ہونے کا معیار اہلیہ کے ساتھ حسن سلوک پر رکھا ہے۔ پس کیا ان فضائل کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام مرد کے خلاف جنسی فرق وامتیاز کی تعلیم دے رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔

۳۔ اسلام نے مرد کو بھی بہت سی خصوصیات وامتیازات سے نوازا ہے، مثلاً خاندان میں مرد کی حیثیت ایک رئیس وامیر کی سی ہے، میراث میں اُس کا حصہ عورت کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ یعنی مرد عورت کا بھی ذمہ دار ہے، مرد کی گواہی عورت کے مقابلہ میں بعض امور میں دوگنی ہے، ایک طرف جہاں مرد کو بعض حقوق دیئے گئے ہیں وہی اس پر عائد ذمہ داری بھی بڑھا دی گئی ہے، اور عورت بہت سی ذمہ داریوں سے بریء الذمہ ہے، چنانچہ گھر کے مالی اخراجات کا ذمہ دار مرد قرار دیا گیا ہے، نیز اسی پر گھر کی دیکھ ریکھ اور حفاظتی ذمہ داری عورت کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے بہت سے امور میں مرد وعورت میں کوئی فرق نہیں کیا ہے، جبکہ بعض کو بعض حیثیتوں سے دوسرے پر فوقیت وامتیاز حاصل ہے، جس سے واضح ہوا کہ نہ تو اسلام نے مرد وعورت کو ایسا برابر رکھا ہے کہ جیسا دن دوسرے دن سے مشابہ ہوتا ہے، اور رات دوسری رات سے مشابہت رکھتی ہے، بلکہ دونوں میں ایسی تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کی ہے جیسے رات اور دن میں میل اور جوڑ سے ہے، اور ایک کو دوسرے سے غنا اور بے نیازی نہیں، بلکہ دنوں میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے معین ومددگار ہے اس طرح پر کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مثالی زندگی نہیں گزار سکتے، جس طرح کہ رات دن سے

❶ ترمذی باب البر والصلة. ❷ ترمذی : باب المناقب.

بے نیاز نہیں ہوسکتی اور نہ دن رات سے بے نیاز ہوسکتا ہے بلکہ ایک پورے کامل روز کے لیے رات اور دن دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

اس موقع پر ہم ایک بات واضح کرتے چلیں کہ جب ہم کسی معاملہ میں اسلام کی تعلیمات بیان کررہے ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کے موجودہ عمل کو بھی واضح کرتے چلیں کیونکہ وہ بہت سے امور ومعاملات میں اسلامی تعلیمات منحرف اور ہٹے ہوئے ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کا عمل یہ دونوں مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لیے عورت کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ اسلام کی روشنی میں کرے نہ کہ سیکولرازم کی روشنی میں مرد کی برابری کا مطالبہ کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر عورت کو مرد کے مساوی حقوق دیئے جائیں گے تو عورت اپنے بہت سے ایسے حقوق سے محروم ہوجائے گی جو اسلام نے اس کی فطری ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے دیئے ہیں۔

اس تناظر میں اگر ہم فرانس کے انقلاب کی تحریرات کا جائزہ لیں جس میں بڑے زور شور سے مردوزن مساوات کا نعرہ ہے، یا بہت سے جمہوری یا سیکولر ملکوں کے قوانین ودستاتیر کو بنظر غور دیکھیں تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ بہت سے وہ حقوق جو اسلام نے عورت کو آج سے چودہ سو سال پہلے دیئے تھے، یہ مدعیانِ مساوات آج کی صدی میں اس کا اعتراف کررہے ہیں اور اس کا نعرہ لگارہے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ اب بھی بہت سے ایسے حقوق ہیں جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں اور ان ملکوں کے قوانین میں عورت ان حقوق سے ابھی تک محروم ہے، مثلاً اسلام نے خاندان کے نان نفقہ کی مکمل ذمہ داری مرد پر رکھی ہے اور عورت کو اس سے بری الذمہ رکھا ہے، اور عورت مادی ومالی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ [1]

اور دیکھئے امریکی قانون جو سنہ ۱۷۸۷ء میں پاس ہوا، اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک امریکی عورت کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق دیا گیا۔ [2]

---

[1] حقوق الانسان للدوالیبی ص ٤-٥.

[2] دیکھئے: دورین، التجربة الدستورية.

تو کیا ان حقائق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی ایک باشعور مسلم خاتون اُن چیزوں کے حصول کی خواہش کرے گی جو مغرب میں عورت کو دی گئی ہیں اور اُن حقوق اور امتیازات اور خصوصیات سے دستبراد ہونا گوارا کرے گی جو اسلام نے اس کو عطا کیے ہیں؟

سیاسی سرگرمیوں میں عورت کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟:

اسلام میں عورت سے متعلق جن فطری صفات کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا ہے اُن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرد وعورت ہر دونوں میں کچھ ایسی صفات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہیں، مرد سے متعلق جو صفات مذکور ہوئیں ہیں ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرد کے اندر وہ صفات ہیں جو ایک بڑے سربراہ اور حاکم ووالی کے لیے ضروری ہیں، خاص طور پر جب یہ سربراہی اور ولایت اجتہاد، قضاء، اور اوامر کے نفاذ سے متعلق ہو۔(اس مسئلہ میں یہ حدیث شریف دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سنا کہ ملکِ فارس میں لوگوں نے اپنا سربراہ اور حاکم ایک عورت کو بنالیا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جنہوں نے اپنا حاکم ایک عورت کو بنالیا ہو۔'' [1]

جب کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ حدیث عورت کے والی وحاکم بننے کی حرمت پر دلالت نہیں کرتی بلکہ حدیث شریف میں ملکِ فارس میں جو کچھ ہونے والا تھا اس کے سلسلہ میں یہ ایک پیشن گوئی تھی، اور یہ پیشن گوئی پوری ہوکر رہی)۔

رہی دوسری قسم کی ولایتیں تو اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، مثلاً قضاء کے مسئلہ ہی کو لے لیجیے کہ کیا عورت قاضی بن سکتی ہے، یا حسبہ کے مسئلہ میں (حسبہ ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکومتی ادارہ ہوتا ہے)، یا دوسری ادارتی ولایت وغیرہ میں عورت کو کوئی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے؟

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام عورت کو مسئولیت کے تحمل کا اہل قرار دیتا ہے اور وہ بحیثیت خاتونِ خانہ کے ایک گھر کی ذمہ دار، اور گھر کے معاملات میں ایک اہم کردار کی

[1] بخاری: کتاب المغازی.

مالک ہوتی ہے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ذمہ دار سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، حاکم اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا، عورت اپنے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا، اور تم سب ہی ذمہ دار ہو اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔'' [1]

اسلام میں عورت کی ایسی اہمیت ہے جس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں استغنا نہیں برتا جا سکتا۔ چنانچہ مشورہ میں عورت کا ایک اہم کردار ہوتا ہے اور بسا اوقات وہ مردوں سے اس سلسلہ میں فائق ہوتی ہے، بڑے بڑے مسائل اس کے مشورہ سے آسانی سے حل ہو جاتے ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے عورت سے مشورہ کی سنت جاری فرمائی، صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ جن پر وحی نازل ہوتی تھی اپنی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ فرماتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ نے احرام کھولنے کا حکم فرمایا مگر کسی صحابی نے اس حکم پر عمل نہیں کیا، جس کی وجہ تھی کہ مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے درمیان جو صلح نامہ لکھا گیا تھا اس میں ایک شق یہ تھی کہ مکہ سے اگر کوئی مسلمان مدینہ آئے گا تو مدینہ والوں کو اس آنے والے شخص کو مکہ واپس کرنا ضروری ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ آئے گا تو مکہ والے اسے مدینہ واپس نہیں کریں گے، یہ ایک ایسی شرط تھی جس کا قبول کرنا مسلمانوں پر سخت دشوار گزرا۔ چنانچہ اسی فکر اور غم کے احساس نے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسا شکستہ دل کر دیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر وہ فوری عمل نہ کر سکے، جب آپ ﷺ نے یہ صورت حال دیکھی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ فرمایا، انھوں نے آپ ﷺ کو یہ رائے دی کہ یا رسول اللہ! آپ بذات خود حلق کرا کے احرام کھول دیں گے، آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] صحيح بخاری : الجمعة.

بھی حلق کرا کے احرام کھول دیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی رائے پر عمل کیا جس کے بعد تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت تیزی کے ساتھ حلق کرا کے اپنے اپنے احرام کھولنا شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب ہی احرام سے باہر آ گئے۔ ❶

بعض معاملات میں عورت کی گواہی مرد کے مقابلہ میں آدھی کیوں ہے؟:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ م بِالْعَدْلِ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِکُمْ فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی﴾ ❷

''اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا، ایک میعاد متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو ...... اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ بھی کرلیا کرو، پھر اگر دو گواہ مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں کی ایک دوسری کو یاد دلا دے۔''

اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے جو ان تمام معاملات کو شامل ہے جو موجل یعنی موخر ہوں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ ایسی گواہی جس پر قاضی اعتماد کرتا ہے، اور وہ گواہی جو معاملات طے ہوتے وقت ہوتی ہے دونوں میں فرق ہے، پہلی قسم کی شہادت کے مقبول

❶ زاد المعاد لابن القیم ج۳/ ۲۹۵.

❷ البقرة: ۲۸۲۔ دیکھئے: تفسیر ابن کثیر.

ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں مثلاً بعض معاملات میں رشتہ دار کی گواہی مردود ہے اگر چہ وہ مرد ہی ہو، جبکہ اجنبی وغیر رشتہ دار عورت کی گواہی مقبول ہوتی ہے۔

جب کہ اس کے ساتھ اسلام نے گھر اور خاندان کی پوری ذمہ داری مرد کے کاندھوں پر ڈالی ہے اس لیے کہ اس میں ہی ایسی صفات ہیں جو ایک ذمہ دار شخص کے اندر ہونی چاہیے برخلاف عورت کے کہ اس میں مرد کے مقابلہ میں وہ صفات نہیں ہوتیں، اسی لیے ذمہ داروں کی بات اوران کی رائے کا ایک وزن ہوتا ہے حتی جمہوری نظام میں اس کی ایک اہمیت ہوتی ہے، چنانچہ قائداور سربراہ اور ذمہ دار کی رائے ایسے معاملہ میں جس میں طرفین کی تعداد برابر ہوتو اس وقت سربراہ کی رائے جس نصف کی طرف مل جاتی ہے وہ رائے راجح ہو جاتی ہے۔

مرد وعورت کی مذکورہ فطری اور خلقی صفات میں اختلاف کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مرد کی ذات ماحول سے زیادہ باخبر ہوتی ہے اس لیے بہت سے معاملات میں وہ گواہی کے لیے زیادہ موزوں ہے، اوراس کی گواہی زیادہ وزنی ہوتی ہے،اوراس کی گواہی بہت سے ایسے حالات میں کم مفاسداور خطرات رکھتی ہے جس شہادت وگواہی سے خطرات واقع ہونے کا امکان ہو۔

بعض ایسے معاملات اور امور بھی ہوتے ہیں جن میں عورت کی گواہی مرد کے مساوی اور برابر ہوتی ہے۔ جیسے کہ (سورة النور : آیة ٦ ـ ٩) میں شوہر چار مرتبہ قسم کھاتا ہے تا کہ عورت پر زنا کی تہمت ثابت کرے، اسی طرح عورت بھی چار مرتبہ قسم کھاتی ہے تا کہ اپنی ذات کو اس تہمت سے بری ثابت کرے) اسی طرح متعدد عظیم اہمیت کے حامل مسائل میں بھی مرداورعورت کی شہادت مساوی ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ:

مسلمانوں نے اپنے بہت سے دینی مسائل رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے سیکھے ہیں۔

کچھ معاملات وامور ایسے بھی ہیں جو عورت کی ذات سے خاص ہیں اورمرد کے لیے ایسے معاملات میں گواہی دینا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ ایسے امور ومعاملات میں صرف عورت ہی کی گواہی

پر انحصار ہوتا ہے، اسی طرح بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جو مرد کے ساتھ خاص ہوتے ہیں اس میں عورت کے لیے ممکن نہیں کہ وہ گواہی دے سکے چنانچہ ایسے امور ومعاملات میں صرف مرد کی گواہی پر انحصار کیا جاتا ہے، اس لیے گواہی کے سلسلہ میں یہ بات نہیں کہ جو گواہی اور شہادت کا مستحق ہے وہ زیادہ افضل ہے اور جو گواہی نہیں دے سکتا وہ غیر افضل، بلکہ گواہی جس معاملہ میں دی جاتی ہے اس معاملہ کی اہمیت اور اس کی نوعیت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

جس طرح کہ عورت کی ذات بچوں کی پرورش اور اُن کی دیکھ ریکھ کے لیے زیادہ موزوں ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ماں باپ میں تفریق اور جدائی پیدا ہوجائے تو لا دین حکومتوں میں بھی بچہ کی حضانت اور پرورش کا حق عورت کو دیا جاتا ہے۔ (مثلاً دیکھئے امریکہ کا قانون) پس کیا اس مسئلہ کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ حضانت اور پرورش کے معاملہ میں اس نظام نے عورت مرد میں برابری اور مساوات نہیں رکھی کہ عورت کو تو حضانت کا حق دیا ہے، جب کہ مرد کو اس سے محروم کیا گیا ہے؟ یا یہ کہ اسلام نے عورت کو مرد کے ساتھ برابری کا حق نہیں دیا؟

یقیناً جواب نفی میں ہی ہوگا، البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ماں مرد کے مقابلہ میں بچہ کی پرورش کی ذمہ داری زیادہ احسن طریقے پر پورا کرسکتی ہے، اور مرد گواہی کے بہت سے معاملات میں عورت سے زیادہ موزوں ہے۔

عورت بعض حالات میں مرد سے آدھی میراث کی مستحق کیوں ہوتی ہے؟

گزشتہ سطور میں مرد وعورت کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات اور امتیازات جو ذکر کیے گئے ہیں اُن کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام نے مرد پر زندگی گزارنے کے اسباب فراہم کرنے کی ذمہ داری عائد کی ہے، خواہ یہ ذمہ داری بیوی سے متعلق ہو یا بچوں سے، یا اپنے معذور والدین سے متعلق ہو، یا ان چھوٹے بھائیوں سے متعلق ہو جو کمانے پر قادر نہیں، یا اُن بہنوں سے متعلق ہو، جو غیر شادی شدہ ہیں، جب کہ عورت پر اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی گئی، یہاں تک کہ اگر عورت کے والدین یا والدین کے ماتحت بچے بھی اگر کمانے پر

قادر نہیں تو عورت پر اُن کے اخراجات پورا کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے اسی بنا پر ایک مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے زکوۃ کے فریضہ کی رقم اپنی بیوی یا اولاد کو دے، کیونکہ ان کے اخراجات کا ذمہ دار تو وہ خود ہے ہی ، اور اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ وہ ان کے اخراجات پورے کرے ، نہ یہ کہ وہ اُن پر زکوۃ خرچ کرے ، کیونکہ زکوۃ کے مصارف متعین ومحدود ہیں انہی مصارف میں زکوۃ صرف کی جاسکتی ہے، چنانچہ اِن محدود ومعین مصارف کے ذریعہ بعض مستحقین کی کبھی مستقل ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں کبھی وقتی تو کبھی اس مد کے ذریعہ بعض دیگر مصالح اورضرورتیں بھی پوری ہوجاتی ہیں ، ان مصارف کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ارشادفرمایا:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝﴾ (التوبة : ٦٠)

’’صدقات تو صرف غریبوں اورمحتاجوں کا حق ہے، اور جو کارکن ان صدقات پر مستحق ہیں ، اور جن کی دلجوئی کرنا ہے، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں ، اور قرضداروں کے قرضہ میں اور جہاد میں اور مسافروں میں ، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے، اور اللہ تعالی بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔‘‘

عورت کو اس بات کا پورا حق ہے کہ وہ اپنی شادی سے پہلے یا شادی کے بعد کی اپنی تمام ملکیت پر قابض رہے ، بلکہ وہ اپنے شوہر کو اجرت پر اپنے ذاتی مالی ذمہ داریوں کے لیے رکھ سکتی ہے ، اسلام نے عورت کی ذات وشخصیت کے قانونی حق وحیثیت کو شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی برقرار رکھا ہے، شادی سے پہلے وہ اپنے باپ کے خاندان سے اپنا انتساب رکھتی ہے اور شادی کے بعد بھی اس کی نسبت باپ کے ساتھ قائم رہتی ہے ، شادی کے بعد اس کا لقب نہیں بدلتا ، جیسا کہ عصر حاضر میں بعض معاشروں میں یہ رواج ہے کہ شادی سے پہلے عورت اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام استعمال کرتی ہے اور شادی کے بعد اپنے نام کے

ساتھ باپ کے نام کے بجائے شوہر کا نام استعمال کرتی ہے، اور اس پر اس کو اس کے معاشرہ کی روایات یا قانون مجبور کرتا ہے گویا کہ اس کی ملکیت شادی کے بعد اس کے باپ کے خاندان سے اس کے شوہر کے خاندان کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

دوسری جانب اگر ہم سورۂ نساء کی آیت (۱۱) پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میراث میں زیادتی کی وجہ ذمہ داری اور زیادہ نفع رسانی پر ہے، چنانچہ اگر کسی وجہ سے ذمہ داری منعدم ہوجاتی ہےتو میراث کی زیادتی بھی کمی میں تبدیل ہوجاتی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ أَبَوٰهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَ أَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًاo﴾ (النساء : ۱۱)

''اللہ تعالی تم کو حکم دیتا ہےتمہاری اولاد کے بارے میں، لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصہ کے برابر، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو تہائی ملے گا، اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے، اور اگر ایک ہی لڑکی ہوتو اس کو نصف ملے گا، اور ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ہے (یہ اس حالت میں ہے) اگر میت کے کچھ اولاد ہو، اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو، اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے، اور گر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا) وصیت نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جائے یا قرض ادا

کرنے کے بعد، تمہارے اصول وفروع جو ہیں تم پورے طور سے نہیں جان سکتے کہ ان میں کونسا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے، یہ حکم منجانب اللہ مقرر کردیا گیا، بلا شبہ اللہ تعالی بڑے علم وحکمت والے ہیں)۔''

پس کسی شخص کے اگر ایک ہی لڑکی ہے تو وہ اپنے باپ کی میراث کے ادھے حصہ کی وارث ہوگی، اور بقیہ مال میں دوسرے ورثاء حقدا رہوں گے، خواہ وہ بقیہ وارثین مرد ہوں یا عورتیں، اور اگر مرنے والے کی اولاد میں صرف دولڑکیاں ہوں تو وہ اپنے باپ کی میراث کے دوتہائی کی حقدار ہوں گی، اور بقیہ ایک تہائی حصہ میں دوسرے ورثاء شریک ہوں گے۔

اس تقسیم سے واضح ہوا کہ میراث کے استحقاق میں قرابت اور مسئولیت وذمہ داری کو بڑا دخل ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مال کے آنے کا راستہ صرف، میراث ہی نہیں اور نہ کسی کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ میراث پر بھروسہ کرکے بیٹھ رہے، اسلیے کہ اللہ تعالی نے مرد وعورت کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کو وہ خصوصیتیں اور امتیازی خوبیاں عطا فرمائیں ہیں جن کی انسانی معاشرہ کوضرورت ہوتی ہے،اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں جنسوں یعنی مرد وعورت کوعقل وشعور سے نوازا، نیز ذاتی کمائی کے مواقع میسر فرمائے، البتہ معذورین اور عاجز افراد کی ذمہ داری معاشرہ کے صحیح وسالم افراد پر عائد کی گئی، اور زکوۃ کے نام سے باحیثیت لوگوں کے مال میں ایک معین ومحدود مقدار فرض کی گئی اور اس کی ادائیگی پر اُن کو ابھارا گیا۔

اسلام کے اس نظام کے برعکس یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کو مرد کے برابر میراث کا مطالبہ کرنے کا حق تو ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ یعنی عورت گھر سے متعلقہ امور کی ذمہ داریوں میں مرد کے برابر کا کردار ادا کرے۔

بعض وضعی قوانین میں طلاق کے بعد میراث کو مرد وعورت کے درمیان تفریق کے وقت برابر تقسیم کردیا جاتا ہے، جب کہ مال ودولت میں جو مرد وعورت کے درمیان تقسیم کی جارہی ہے، مرد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا بلکہ کُل یا اکثر ثروت ودولت عورت کی اپنی ذاتی کمائی ہوتی ہے

یا اُس کو میراث میں ملی ہوتی ہے،(اس سے معلوم ہوا کہ وضع کردہ اس قانون کے مطابق اس تقسیم میں عدل کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا اور ایک کی ثروت و دولت کو دونوں میں متساوی تقسیم کر دیا گیا جو غیر منطقی و غیر عقلی ہے)۔

اسلام میں عورت کے نکاح اور طلاق کا ضابطہ کیا ہے؟:

اسلام کا اصل ضابطہ تو یہی ہے کہ عورت ولی کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ البتہ فقہا نے بعض استثنائی صورتوں میں عورت کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنا نکاح خود کر لے یا کسی وکیل کے واسطہ سے کرے جس کو وہ خود منتخب کرے۔راجح قول کے مطابق عورت اپنے ولی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی، اس لیے کہ شادی سے پہلے عورت کے اخراجات اورمصارف اس کے والد یا بھائی یا بیٹا برداشت کرتے ہیں،شادی کے بعد اگر شادی کامیاب نہیں ہو پاتی ہے تو بھی یہ عورت اپنے ولی امر (باپ، بھائی، بیٹا) کے پاس ہی آتی ہے اور پھر وہی اس کے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسی طرح اگر شوہر بچوں پر خرچ سے عاجز ہو گیا یا بغیر عجز ہی کے اُس نے بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری سے انکار کر دیا ان دونوں صورتوں میں بھی عورت کا ولی ہی مجبور ہو کر عورت اور اس کے بچوں کی معاش اور تربیت کی ذمہ داری اُٹھاتا ہے۔

پھر یہ کہ فقہاء کرام میں سے بعض فقہاء نے اس کی اجازت بھی دی ہے کہ بعض حالات میں عورت کو یہ حق ہے کہ وہ بذات خود بغیر ولی کے اپنی شادی کر لے۔

جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے تو طلاق کا اختیار اسلام نے مرد ہی کو دیا ہے، اس لیے کہ اسلام شادی کے وقت مرد کو اس بات کا مکلّف بناتا ہے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے، جب کہ عورت کو کسی چیز کا مکلّف نہیں بناتا کہ وہ شوہر کو دے،اس کے ساتھ ساتھ مرد کے اوپر ہی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ گھر بسائے، جب کہ اس طرح کی کوئی ذمہ داری عورت پر نہیں،مرد ہی کے ذمہ یہ بھی ہے کہ وہ عورت کے رہنے سہنے کے لیے مکان، کھانے پینے کے لیے اشیائے خورد و نوش، پہننے کے لیے لباس پوشاک اور اور عورت کی بیماری میں علاج و معالجہ کا انتظام

کرے، یہاں تک اگر میاں بیوی میں جدائی ہوجائے تو عورت کے بچوں کے اخراجات مرد ہی کے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ شوہر کی حیثیت گھر اور خاندان میں ایسی ہے جیسے کوئی حکومت اپنے ملک میں، جس کے لیے بعض صلاحیتوں کا ہونا لازمی ہے، مثلاً: ایسی صلاحیت اور قدرت کا ہونا جس کے ذریعہ سے وہ گھر وخاندان کو پہنچنے والے نقصانات کے وقت دفاعی کردار ادا کر سکے، اور نقصانات پہنچانے والے کو سزا دے سکے، اس لیے کہ کوئی بھی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنا دفاع نہ کرسکتا ہو اور مجرمین کو سزا دینے پر قادر نہ ہو۔

اس لیے خاندان کے ذمہ دار کو اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کے لیے توبیخ اور تادیب کرے خواہ اس کو پٹائی کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے، چنانچہ مرد کو یہ حق ہے کہ تادیب کے طور پر طلاق سے پہلے عورت کو سمجھائے، سرزنش اور ہلکی پھلکی مار سے اس کی اصلاح کرے، البتہ ایسی مار مارنا جس میں ذلت ہو رسوائی ہو، یا چہرہ پر مارنا، یا ایسی مار مارنا جو اُس روح کے منافی ہو جو میاں بیوی کے مابین ہوتی ہے جس کی بنیاد پیار ومحبت ہے قطعاً درست نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالی نے ایک خاندان کے افراد کے درمیان کے تعلقات کو ایسا مستحکم ومضبوط بنایا ہے جس میں محبت وپیار اور باہمی الفت ایک لازمی جزء ہے بالخصوص یہ چیز میاں بیوی کے درمیان ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ [1]

اسلام نے جہاں ایک طرف شوہر کو طلاق کا حق دیا ہے وہیں عورت کو بھی اس کا پورا حق دیا ہے کہ جب اُس پر شوہر ظلم یا زیادتی کرے تو اپنے گھر والوں سے اس معاملہ میں فریادرسی کرے، یا حکومت سے مدد طلب کرے یا ایسے صلح کرانے والوں کو درمیان میں ڈال لے جو طرفین کے درمیان افہام وتفہیم کے ذریعہ معاملہ کا مناسب حل نکالیں، نیز اسلام نے عورت کو یہ بھی حق دیا ہے کہ اگر شوہر ازدواجی حقوق پورا کرنے سے قاصر ہے تو وہ اس سے طلاق

[1] الخطاب الاسلامی للصینی.

حاصل کر لے ، یا کچھ دے کر (مثلاً مہر واپس کر کے یا کوئی دوسری مادی چیز ، یا شادی کے اخراجات کا عوض دے کر) شوہر سے خلع حاصل کر لے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ طلاق کو اسلام میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ، چنانچہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالی حلال کردہ چیزوں میں سب سے بری چیز طلاق ہے۔ [1]

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس سب کے باوجود اللہ کے نزدیک طلاق سب سے بُرا حلال ہے۔ مرد عورت کے مقابلہ میں زیادہ شعور رکھتا ہے ، اور وہ چونکہ شادی اور اولاد کے اخراجات ومصاریف طلاق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی برداشت کرتا ہے اس لیے وہ اس بات کا زیادہ حریص ہوتا ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی قائم ودائم رہے ، ان مذکورہ وجوہات واسباب کی بنا پر طلاق کا حق مرد کو دیا گیا ہے نہ کہ عورت کو۔

ایک مسلمان عورت غیر مسلم سے شادی کیوں نہیں کرسکتی ؟ :

اسلام عورت کے حقوق کی پاسداری کا حریص ہے۔ اس لیے اسلام نے عورت کو جہاں حقوق دیئے ہیں وہیں اس کے حقوق کی پاسداری بھی کی ہے ، اسی وجہ سے ایک مسلمان خاتون کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرے جس کا مذہب خاتون کے مذہب کے احترام کی تعلیم نہیں دیتا ، لہٰذا مسلمان عورت کے لیے حرام ہے کہ وہ کسی غیر مسلم سے شادی کرے ، البتہ مسلمان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرے ، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ (المائدة : ٥)

”آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال رکھی گئیں ، اور جن لوگوں کو کتاب دی

[1] ابو داؤد : کتاب الطلاق.

گئی (یعنی اہل کتاب یہود ونصاری) اُن کا ذبیحہ تم کو حلال ہے، اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے، اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں، اور پارسا عورتیں اُن لوگوں میں سے بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (یعنی اہل کتاب) جب کہ تم اُن کو اُن کا معاوضہ (یعنی مہر) دیدو، اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ، نہ تو علانیہ بدکاری کرو، نہ خفیہ آشنائی کرو۔''

شریعتِ اسلامی کے صاف نصوص کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمان اور غیر مسلمان کے سلسلہ میں شادی کی اجازت کا استثنا صرف اہل کتاب سے متعلق ہے، اور اس میں حکمت کیا ہے اس کے لیے درج ذیل دواہم اسباب پر نظر ڈالیں:

ا۔ یہودی اور نصرانی عورت کا اُن مذہبوں سے تعلق ہے جن کا اعتراف اُن کی اصلی شکل وصورت میں اسلام نے کیا ہے، باالفاظِ دیگر یہ مذاہب اپنے اپنے وقتوں میں اسلام ہی تھے، جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس کا بیان وارد ہوا ہے۔ [1]

پس مسلمان شوہر از روئے مذہب اس بات کا پابند ہے کہ وہ انبیائے سابقین کا احترام کرے، اور چونکہ اس کی بیوی اُن مذاہب میں سے کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہے (مثلاً یہودیت یا نصرانیت سے) جن کا احترام واعتراف کرنا اسلام کی رُو سے اُس پر لازم ہے، اس لیے بیوی کے مذہب کا احترام بھی وہ یقیناً کرے گا۔

لیکن غیر مسلم شوہر پر اس کے مذہب کی رو سے یہ لازم نہیں کہ وہ اسلام کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا احترام کرے، بلکہ اُس غیر مسلم شوہر کا اپنے دین کا پیرو کار رہونے کے معنی یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر ہے، لہٰذا ایک مسلمان عورت کسی بھی طرح غیر مسلم کے نکاح میں آ کر چین وسکون سے نہیں رہ سکتی کیونکہ یہاں دونوں کے دینوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور دونوں کا آپس میں تضاد ہے۔

---

[1] مثلاً دیکھئے: سورۃ البقرۃ : آیات : ۱۲۸۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳، سورۃ آل عمران : ٦٧۔ سورۃ یونس : ۷۲، ۹۰، اور دیکھئے کتاب القاضی کہ اس معنی کی بیس آیات نقل کی ہیں۔

اس حقیقت کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی بے دین یا بُت پرست عورت سے شادی کرے کیونکہ شوہر کا مذہب لادینیت اور وثنیت و بت پرستی کا مخالف ہے۔جس کے نتیجہ میں وہ غیر مسلم عورت مسلمان کے نکاح میں آکر پریشان رہے گی کہ مسلمان کے یہاں کسی لادینیت اور بت پرستی کی ہرگز گنجائش نہیں۔

۲۔ اسلام نے عورت کو بہت سے حقوق دیئے ہیں، چنانچہ اس کو (بعض معاملات میں) آزادی اور برابر کا حق دیا ہے، شوہر کے ذمہ بعض حقوق واجب قرار دیئے، اسلام چونکہ ایک خدائی اور ربانی دین ہے اس لیے اس کے احکامات اور قوانین میں آئے دن تبدیلیاں نہیں ہوتیں، اس کے برخلاف اگر شوہر غیر مسلم ہے یا وہ بے دین ہے، یا اس کا دین ایسا ہے جس میں بیوی کے حقوق شوہر کے ذمہ واجب ہی نہیں، یا عورت کے حقوق کی تعیین وتشریع اکثریت کے رائے کے تابع ہے، جس میں اس بات کا قوی احتمال ہے کہ عورت کو جو حقوق دیئے جارہے وہ صحیح ہوں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ وہ غلط ہوں، نیز زمانہ کے ساتھ اس میں تغییر وتبدیلیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں، جس کا اندازہ اُن ملکوں کے قوانین ودستوروں سے لگایا جاسکتا ہے جو سیکولرازم یا جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں کہ آئے دن اُن ملکوں میں قوانین اور حقوق میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اس لیے کہ ان ممالک میں قانون سازی کا ادارہ اکثریت کے تابع ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس ملک کے قوانین میں بہت سے تضادات اور تناقضات واقع ہوتے رہتے ہیں، اور اُن میں اکثر اوقات تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، آج کوئی قانون ہے تو کل وہ کالعدم ہوکر اس کی جگہ دوسرا قانون پاس کردیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف اسلام کے دیئے گئے حقوق اور اس کے قوانین واحکام ثابت شدہ ہیں، ان میں کوئی تناقض وتضاد نہیں، چنانچہ اسلام نے عورت کے حقوق کی حفاظت کی ہے، اس کی عزت وناموس کا خیال رکھا ہے، اسی وجہ سے اسلام میں کسی دوسرے مذہب سے یہ تعارض

نہیں کہ وہ مذہب اپنی پیروکار غیر مسلم عورت کو مسلمان سے شادی کیوں اجازت نہیں دیتا؟ اس لیے کہ اسلام عورت کے حقوق کا داعی ہے، وہ بھی نہیں چاہتا کہ کوئی غیر مسلم عورت مسلمان سے شادی کرے، اس لیے کہ اس صورت میں عورت کی مذہبی مصالح یا اس کے نظریات میں خلل واقع ہوگا اور وہ (مسلم) شوہر کے نظریات سے متصادم ہوں گے جس سے دونوں کی زندگی مشکلات سے دوچار ہو جائے گی۔

اسلام میں تعددِ ازواج کی اجازت کیوں؟:

یہ بات درست ہے کہ اسلام مرد کو چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ ان کے درمیان عدل کا معاملہ کرے: اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (النساء: ۳)

''اُن عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو، دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے، پس اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ ان میں عدل نہ کر پاؤ گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔''

نیز ایک دوسری جگہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ مکمل عدل تو کر ہی نہ پاؤ گے:

﴿وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ﴾ (النساء: ۱۲۹)

''اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں برابری کرسکو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے، پس تم بالکل ایک ہی طرف بھی نہ مائل ہو جاؤ۔''

اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت کو بہت سی خواتین نے سلبی نظر سے دیکھا، حالانکہ اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ تعدد ازواج کی اجازت ایک عطیہ الٰہی ہے بالخصوص ایسی خواتین کے لیے جن کی بعض اسباب کی وجہ سے شادی نہ ہوئی ہو، شادی نہ ہونے کے بعض اسباب کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے، اس لیے اگر ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرلے تو عورتوں کی ایک بڑی تعداد شادی سے محروم وہ جائے گی، یہاں یہ بات واضح ہو کہ عورتوں کی عمریں عموماً مردوں سے لمبی ہوتی ہیں۔

۲۔ اللہ تعالی کے اس عطیہ (یعنی چار شادی کی اجازت) سے دنیا میں عورتوں کی شادیوں میں چار گنا اضافہ ہوجائے گا، پس اگر ہر مرد صرف ایک ہی عورت سے شادی پر اکتفا کرے، تو تین گنا عورتوں کو شادی کا موقع نہیں مل سکتا، برخلاف اس کے کہ اگر ایک مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت دی جائے تو پھر عورتوں کے لیے چار گنا زیادہ شادی کے امکانات بڑھ جائیں گے،اور اس میں بھی عورت ہی کی بھلائی ہے اگر وہ چاہے تو شادی کرے ورنہ اس کو اسلام شادی پر مجبور بھی نہیں کرتا۔

۳۔ تعدد ازواج کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایک عورت دوسری بیویوں کی شریک ہوتی ہے تو وہ ادبی اور مالی حقوق کی مستحق ہوجاتی ہے، اس کی جنسی خواہش پوری ہونے کے ساتھ ماں بننے پر ماں کی ممتا کی نعمت بھی اسے میسر آتی ہے برخلاف اس عورت کے جس کو شوہر نصیب ہی نہ ہوا ہو،اس لیے تعدد ازواج اس سے بہتر ہے کہ عورت اپنی جنسی خواہش غیر فطری وناجائز طریقہ پر پوری کرے، یا وہ ماں بننے کی عظیم نعمت سے محروم رہے، یا بیوی بن کر جو مالی وادبی حقوق بھی اسے ملتے ہیں اُن سے محروم رہے، نیز عورت اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کو بہت سی مالی وغیر مالی ذمہ داریاں اُٹھانا پڑتی ہیں جن کو بسا اوقات عورت برداشت نہیں کر پاتی اور اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، مزید برآں یہ کہ بے شوہر کی عورت مردوں کا نشانہ بن کر بے وقعت اور ذلیل و رسوا ہو کر اپنی عزت وناموس گنوا بیٹھتی ہے۔

وہ خواتین جو شادی شدہ ہیں وہ تو یقیناً تعدد ازواج کو سلبی نظر سے ہی دیکھیں گی ،اس لیے کہ تعدد ازواج کا حکم اُن کی فطرتِ انوثت کے خلاف ہے،عورت کے اندر غیرت کا ہونا

ایک طبعی اور فطری امر ہے جس سے کوئی عورت خالی نہیں ہوتی، تاہم بعض ایسی دانشمند خواتین بھی ہوتی ہیں جو اجر وثواب کی نیت سے، اور اس نیت سے کہ دوسری کسی عورت کا بھی بھلا ہوجائے کہ اسے بھی اپنی فطری خواہش پورا ہونے کا وسیلہ میسر ہوجائے، اپنے شوہر کے لیے دوسری بیویوں کی شرکت کو قبول کرلیتی ہیں اور سوتن کو برداشت کرلیتی ہیں۔

تعدد ازواج کا معاملہ فی نفسہ برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ اُس کی وجہ سے عموماً پہلی بیوی پر جو ظلم ہوتا ہے وہ تعدد ازواج کے معاملہ کو داغدار بنادیتا ہے مثلاً جن معاشروں میں پردے کا رواج نہیں وہاں بارہا ایسا ہوا کہ ایک شخص کو کوئی دوسری عورت پسند آ گئی یا کسی عورت نے اس کو اپنی محبت کے جال میں پھنسالیا تو اب مرد اس عورت سے شادی کرنے کے لیے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، جبکہ اسلام میں تعدد کا مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی ہی ہو رہے اور اپنے شوہر کی حفاظت کرے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مرد کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی کرلے، لیکن عورت کے لیے یہ اجازت ورخصت نہیں آخر ایسا کیوں؟ بظاہر یہ سوال بڑا پرکشش ہے، لیکن ذرا یہ سوچیے کہ عورت کو اگر تعدد کی اجازت دیدی جائے تو اس میں عورت کا کیا فائدہ ہے؟ کیا عورت کا دوسرا شوہر عورت کے بچوں کے لیے باپ کی ذمہ داری نبھائے گا؟ اور کیا اس کو دوسرا شوہر وہ حق دے سکتا ہے جو اس کو پہلا شوہر دیتا ہے، یا کیا یہ دوسرا شوہر اس بیوی کے دکھ درد میں اور پریشانی کے حالات یا بڑھاپے یا مرض جیسے احوال میں کام آئے گا؟ یقیناً ہر شخص اس کا جواب نفی میں ہی دے گا، اس لیے کہ اگر عورت کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دیدی گئی تو مرد کے لیے بیوی کی ذمہ داریوں سے بھاگنے کا اچھا موقع ہاتھ آ جائے گا اور جنسی تعلقات کی وجہ سے اُس پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں اُن سے وہ کنارہ کرلے گا، جس کے نتیجہ میں اولاد کا مستقبل تاریک ہوجائے گا، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی باشعور خاتون اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کے دو شوہر ہوں، اس مسئلہ سے متعلق ایک اشارہ عنقریب ایک حدیث شریف میں آئے گا جس میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔

عورت کو گاڑی چلانے کی اجازت کیوں نہیں؟:

کسی اجتہادی امر پر حلت یا حرمت کا حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نصوص شرعیہ پر گہری نظر کے ساتھ حالات واقعات پر بھی عمیق نظر ہو اور پھر دونوں میں تطبیق دی جائے ، چنانچہ ہم نصوص شرعیہ کی تطبیق اور حالات کے تناظر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو گاڑی چلانے سے منع نہیں کیا ، اور نہ عورت کو گاڑی چلانے کی ترغیب دی ہے ، اس مسئلہ میں اعتبار اُس معاشرہ کا ہوگا جہاں عورت رہتی ہے ، چنانچہ بعض اسلامی معاشروں میں مسلمان عورت اُس پردہ کی مکمل پابندی کرتی ہے جس کا شریعت نے اس کو حکم دیا ہے ، یعنی مکمل طور پر وہ اپنے چہرے کو ڈھانکتی ہے ، اور پردہ کے سلسلہ میں اُن علماء کے قول پر عمل کرتی ہے جو چہرہ کے ڈھانکنے کا حکم دیتے ہیں ، ایسے معاشرہ میں گاڑی چلانے کا مسئلہ معاشرہ کے ماحول پر موقوف ہے ، چنانچہ ایسے معاشرہ میں عورت کے لیے یہی افضل ہے کہ عورت گاڑی خود نہ چلائے بلکہ کوئی دوسرا ہی گاڑی چلائے ، اور یہ طبیعت ومزاج کے مطابق ہے ، حتی کہ بعض مرد بھی یہ پسند کرتے ہیں کہ اُن کے پاس مستقل ڈرائیور ہو جو اُن کی گاڑی چلائے ، یا کوئی ایسا ڈرائیور ہو جو مستقل نہ سہی لیکن وقت پر کام آئے ، ایسے ڈرائیور کا زیادہ خرچ بھی ذمہ نہیں آئے گا۔

البتہ اگر مسلمان عورت کسی ایسے معاشرہ میں رہتی ہے جہاں کے رواج میں عورت ادنی درجہ کا پردہ کرتی ہے اور ایسے مسلم علماء کی رائے پر عمل کرتی ہے جو عورت کو چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت دیتے ہیں ، البتہ باحیا اور ساتر لباس پہنتی ہیں کہ چہر کے علاوہ سر اور بقیہ تمام جسم کو ڈھانکتی ہیں ، اور اُس معاشرہ میں عورت کے لیے چہرہ کھلا رکھنا بھی کوئی معیوب نہیں تو ایسے معاشرہ میں عورت کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ خود گاڑی چلائے ، مگر عموماً یہ دیکھا گیا ہے ایسے معاشروں میں بھی خواتین اسی کو پسند کرتی ہیں کہ وہ خود گاڑی ڈرائیو نہ کریں بلکہ مستقل ڈرائیور ہی ہو جو اُن کی گاڑی چلائے۔

عورت کے لیے پردہ کیوں ضروری ہے؟:

شاید کوئی غیر مسلم عورت یہ سوال کرے کہ اسلام میں عورت کے لیے پردہ کیوں ہے؟ اس قسم کا سوال کسی غیر مسلم سے ہی ممکن ہے کسی مسلمان خاتون سے ممکن نہیں کیونکہ مسلمان خاتون جانتی ہے کہ اللہ تعالی نے اس پر جو چیز فرض کی ہے اس میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے، اور اگر اس نے اللہ تعالی کے حکم کی فرماں برداری نہ کی تو اس کو اس کی سزا برداشت کرنا ہوگی۔

بعض لوگ پردہ کو منفی نظر سے دیکھتے ہیں، جب کہ بہتر یہ ہے کہ اس کو واقعیت کے تناظر میں دیکھا جائے تاکہ عورت کے لیے پردہ کا مثبت پہلو سامنے آئے۔

اسلامی پردہ عورت میں ایک خاص قسم کی خوداعتمادی پیدا کرتا ہے، پردہ سے ایک عورت اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتی ہے، پردہ سے عورت کے جسمانی نزاکت اور اس جسمانی کمزوری چھپ جاتی ہے بلکہ ایک اعتبار سے پردہ عورت کی کمزوری اورع نزاکت کا بدل ہے جس سے اسے ایک خاص ہیبت اور وقار حاصل ہوتا ہے۔ پردہ سے عورت بہت سی اُن چھیڑ خانیوں سے محفوظ ہوجاتی ہے جن سے وہ عورتیں محفوظ نہیں رہ پاتیں جو بے پردہ ہوتی ہیں، پردہ عورت کے لیے ایک قسم کی نفسیاتی حفاظتی تدبیر ہے، مثلاً اس کے کپڑے صاف رہتے ہیں، اس کا حسن و جمال مستور رہتا ہے،اس کی وہ قیمتی اشیاء جو وہ پہنتی ہے چھپ جاتی ہیں،عورت کا ڈرائیور، یا سیکرٹری یا محافظ کا ساتھ رکھنا وغیرہ عورت کے رُعب کو بڑھاتا ہے اور اس کے حفاظتی کردار کو تقویت بخشتا ہے، جس کی وجہ سے وہ بہت سی تکلیفوں اور ایذاؤں سے محفوظ رہتی ہے، اسی وجہ سے وہ خاتون جو معاشرہ میں ایک مقام رکھتی ہو اِن چیزوں کو استعمال کرتی ہے، اور جس طرح عورت کو پردہ ایک عزت وقار اور دوسروں پر رغب عطا کرتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فوج میں یا حکومتی اداروں میں ایک خاص قسم کا لباس استعمال کیا جاتا ہے تاکہ دوسروں پر رُعب ودبدبہ قائم ہوسکے، ہمارے اس نظریہ سے شاید ہی کوئی اختلاف کرے۔

اسلام بحیثیت عملی دین کے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں کمال

کی طرف میلان کی عادت پائی جاتی ہے، جس کو اسلام شترِ بے مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اُس کو خیر کی راہوں کی طرف موڑ دیتا ہے، اسلام میں یہ بات ناپسند ہے کہ کسی پھی چیز میں ایسا تجاوز واقع ہو کہ انسان یہ بھی بھول جائے کہ بنیادی صفات ہی اصلی جوہر ہیں، چنانچہ کسی عورت کا اخلاق وکردار اور اس کی سلیقہ مندی اس کا اصلی جوہر ہے جس کی لیے اس کو محنت اور ذاتی کوشش کرنی پڑتی ہے، برخلاف ظاہری زیب وزینت اور بناؤ سنگار کے، کہ اس کے لیے محنت کی ضرورت نہیں یہ چیز کسی کو وہبی مل جاتی ہے تو کسی کو عطیہ سے یا استعارہ سے۔

واضح ہو کہ عورت کی ذات فطری طور پر کشش وجاذبیت رکھتی ہے، یہاں تک کہ پردہ میں بھی یہ کشش وجاذبیت باقی رہتی ہے، پس جس وقت وہ اپنے پرکشش عناصر کو کھولتی ہے تو شوہر کی نظر میں جاذبیت کے ایک بڑے حصہ کو کھودیتی ہے، اور یہ اُن لوگوں کو بھی پسند نہیں جو بلا خرچ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فصل ششم:

اسلام دہشت گردی اور تشدد وزیادتی کا مخالف ہے

متعدد سیاسی قائدین اور اہل فکر و دانش حضرات تشدد(violence) تیاری اور دہشت گردی (Terrorism) کے درمیان اور جارحیت پر مبنی تشدد اور دہشت گردی کے درمیان اورضروری تشدداور دہشت گردی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔اس لیے ہم یہاں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ کلمہ ''ارعاب'' یا کلمہ ''ارہاب'' (خوفزدہ کرنا یا ڈرانا) یہ terrorisim کے معنی میں ہے کیونکہ قرآن کریم میں اس لفظ کی اصل یعنی (الرہب) اور اس کے مشتقات وارد ہوئے ہیں۔جس سے مراد تھوڑا سا خوف ہے جس میں شدت نہ ہو، نیز اس میں کسی چیز کے مقابلہ میں احترام کا پہلو بھی ہو، کبھی انسان اس کو دوسروں کے شر سے بچنے کے لیے بھی تخویف وترہیب کا سامان تیار کرتا ہے۔ [1]

مثلاً کبھی انسان یہ شدید خوف وگھبراہٹ کسی دوسرے شخص کو سزا دینے یا اس پر یا ظلم کرنے کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی بغیر کسی سبب وارادہ کے یا نامعلوم طور پر بھی کسی کے اندر یہ خوف وگھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ [2]

---

[1] دیکھئے: آیات: سورۂ آل عمران: ۱۵۱، سورۂ انفال: ۱۲، سورۂ کہف: ۸،سورة الأحزاب: ۲، سورة الحشر: ۲۔ جب کہ کلمہ "رعب" جس کے معنی شدید خوف اور گھبراہٹ کے ہیں۔ (دیکھئے: آیات: سورة التوبة: ۳٤، سورة النحل: ٥١، سورة الأنبياء: ۹۰،سورةالقصص: ۳۲،سورة الحديد: ۲۷، سورة الحشر: ۱۳.

[2] دیکھئے مثلاً: ابن منظور: البستاني.

عربی زبان میں یہ دونوں کلمے ارہاب وارعاب نہ محض شر کے معنی رکھتے ہیں اور نہ صرف خیر کے، بلکہ یہ دونوں وسیلے ہیں جو خیر یا شر کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ ان کو حق کو حق ثابت کرنے اور باطل کی سرکوبی کرنے اور مظلوم کی نصرت ومدد کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ان کو ظلم کے موقع پر، لوگوں کے باطل طریقہ پر مال واسباب سلب کرنے، اُن کے حقوق چھیننے یا اُن کی اراضی پر قبضہ جمانے وغیرہ جیسے اعمال قبیحہ میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارہاب یا ارعاب کی دو قسمیں ہیں: دفاعی اور ظالمانہ۔ ظالمانہ ارعاب کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہوتا جب کہ دفاعی ارعاب یا ارہاب فطرت اور قوانین کا پابند ہوتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ عنف (تشدد، سختی) اور ''ارہاب'' (تخویف وترہیب) میں ایک واضح فرق ہے کہ عُنف (تشدد وسختی) میں مادی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں، جیسے مارنا پیٹنا، جسمانی اذیت دینا، ہتھیار وغیرہ استعمال کرنا ....تا کہ عُنف (تشدد یا سختی) کرنے والا اِس (سختی یا تشدد) کے ذریعہ اپنے احساسات یا معتقدات یا رائے کے اظہار عمومی یا خصوصی اہداف کو حاصل کرے۔

اور ''ارہاب'' یا ''ارعاب'' (تخویف وترہیب) یہ دونوں کلمے اپنے معنی کے اعتبار سے زیادہ شمولیت رکھتے ہیں، کبھی ان کا استعمال ایسی جگہ پر ہوتا ہے جہاں سخت وسائل اختیار کیئے جاتے ہیں اور کبھی ایسی جگہ بھی ہوتا ہے جہاں ایسے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں جو سخت نہیں ہوتے، مثلاً: حرکات یا اشاروں کے ذریعہ ناگواری کا اظہار کرنا، (مثلاً کوئی شخص ایسا اشارہ کرے کہ گویا وہ ذبح کردے گا)، یا گفتگو اور بات چیت کے ذریعہ مثلاً بائیکاٹ کی دھمکی دینا، یا ملک بدر کرنے کی دھمکی دینا، یا بھوکا رکھنے کی دھمکی، ایٹمی اسلحہ وغیرہ کے استعمال کی دھمکی دینا وغیرہ وغیرہ ...... ارہاب کے زمرہ میں آتا ہے اسی طرح اقتصادی پابندیاں لگانے کی دھمکی دینا بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ اسی طرح ارہاب اور ارعاب ویٹو کا حق استعمال کرنا، یا ظالم کے خلاف رائے شماری کرانے میں بھی استعمال ہوتا ہے، کبھی ان دونوں لفظوں کا

استعمال جھوٹی تہمت لگانے یا کسی معین شخص یا ادارہ کے خلاف میڈیا وار برپا کر کے دشمن کی تصویر مسخ کی جاتی ہے اور اس کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے، یا اپنے کینہ وحسد کو کسی کے خلاف استعمال کرنا وغیرہ مقام پر بھی ہوتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ارہاب اور ارعاب کے ذریعہ دشمن کو فوری راستہ سے ہٹانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اُس کو ایک طویل عرصہ تک ان حربوں کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے، جس کی تکلیف اور رسوائی لمبے عرصہ تک چلتی ہے اور دشمن کو آہستہ آہستہ مارا جاتا ہے، بھوکا رکھا جاتا ہے، یا ملک بدر کیا جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ارہاب (دہشت) یا ارعاب (تخویف) کی اصطلاح استعمال کررہے ہیں وہ تین بنیادی اقسام پر مشتمل ہیں:

۱۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو ان اصطلاحات کو بغیر کسی ضابطہ کے استعمال کررہے ہیں خواہ، یہ استعمال کرنے والے لوگ وہ ہوں جو آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں یا وہ لوگ ہوں جو آخرت کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، ایسے لوگ انسانی فطرت کی بھی مخالفت کررہے ہیں اور انسانی تنظیموں کی بھی۔ اسی طرح یہ لوگ خدائی تعلیمات (بشمول اسلامی تعلیم) کی بھی مخالفت کررہے ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان اصطلاحات کو بقدر الامکان فطری ضوابط کی روشنی میں استعمال کررہے ہیں، یعنی اپنی ذات کے دفاع کے لیے، یا مظلوموں کی داد رسی کے لیے، یا کمزوروں کی مدد کے لیے، اور یہ لوگ آخرت پر ایمان ویقین نہیں رکھتے لیکن اِن کی فطرتِ سلیمہ (جس پر اللہ تعالی نے ان کو پیدا کیا ہے) انہیں اِن خیر کے کاموں پر اُبھارتی ہے۔

۳۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو بقدر امکان فطری اور شرعی ضوابط کے دائرہ میں ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں، مثلاً اپنی ذات کے دفاع میں یا بے گناہ کمزوروں سے ظلم کے ہٹانے کے سلسلہ میں ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ نیت

رکھتے ہیں کہ اِس میں اُن کو آخرت میں خوب اجروثواب ملے گا ، ایسے لوگ کے جذبات فطری بھی ہوتے ہیں یعنی اُن کو اِن خیر کے کاموں پر فطرتِ سلیمہ بھی اُبھارتی ہے اور آخرت میں اجر وثواب ملنے کا یقین بھی انہیں ان باتوں پر اُبھارتا ہے۔

ان تینوں اقسام میں آخر الذکر لوگ زیاد جراءت مندی اور قربانی دینے کا ثبوت دیتے ہیں ، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے لیے دنیاوی زندگی سوائے ذریعہ کے کچھ بھی نہیں ، اور یہ دنیا مقصود کلی نہیں ، یہی وہ جذبہ ہے جو بعض جہادی کارروائیوں میں کارفرما ہے کہ بعض لوگ اپنے مقدس مقامات اور اپنی سرزمین یا مظلوموں کے دفاع میں شہادت کے شوق کے ساتھ جان کی قربانی دیتے ہیں۔

اس طرح کی جہادی کارروائیوں کے سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں ، بعض اس کی اجازت دیتے ہیں اور ترغیب دیتے ہیں بشرطیکہ یہ کارروائیاں حق کے دفاع کے لیے ہوں نہ کہ دوسروں پر زیادتی کے لیے ، نیز اِن استشہادی کارروائیوں کو بے گناہوں پر استعمال کی ہرگز اجازت نہیں ، جیسے کہ حالتِ جنگ تک میں بھی اسلام نے بوڑھوں ، عورتوں ، بچوں ، اور جنگ میں حصہ نہ لینے والوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے ، اور یہ کوئی اسلام ہی کا خاصہ نہیں ہے کہ اس نے حق کے لیے استشہادی کارروائیوں کی اجازت دی ہے بلکہ دنیا میں تمام انسانوں کے قوانین اور نظام میں یہ بات ہے کہ وہ جنگ کے وقت سپاہی کو بہادری اور شجاعت سے جنگ پر اُبھارتے ہیں چاہے فوجی کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

بعض فقہاء اسلام کی اس سلسلہ میں مذکورہ رائے کے برخلاف ہے ، چنانچہ ان کی رائے میں اس طرح کی استشہادی کارروائیاں حرام ہیں ، اُن کا کہنا یہ ہے کہ یہ اپنی جان کو بذاتِ خود قتل کرنے کے مترادف ہے ، اور بہادری اور جان کی بازی لگانے کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص اپنے کو بالکل ہلاک ہی کرڈالے ، ہاں بہادری وشجاعت کے جوہر دکھائے ، اور اس بہادری وشجاعت میں غالب آنے اور زندگی باقی رہنے کا قوی احتمال ہے ، اور عموماً جان کی بازی لگانے والے کے نیت میں موت مقصود نہیں ہوتی بلکہ مقصود فتح وغلبہ کا جذبہ ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے پاس اللہ تعالی کی عطا کردہ رشدہ وہدایت کا کچھ بھی حصہ باقی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ امتحان گاہ ہے جس کے ذریعہ یہ چیز کل قیامت (جو بدلہ کا دن ہے) میں یہ چیز واضح ہوجائے گی کہ کون نیک وصالح ہے جو انعام کا مستحق ہے اور کون طالح وبد ہے کہ جو سزا اور عقوبت کا مستحق ہے، چنانچہ اسی وجہ سے حق اور باطل اور ظالم اور مظلوم کے درمیان کشمکش چلتی رہی ہے اور یہی امتحان کا طریقہ ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ (الحج: ٤٠)

''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالی (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتے رہتے تو (اپنے اپنے زمانہ میں) (نصاری کے) خلوت خانے اور عبادت خانے اور (یہود کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہوگئے ہوتے۔ اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے، بے شک اللہ توانا اور غالب ہے۔''

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے بغیر قصد وارادہ کے (ارہاب وارعاب) دہشت وخوف کا صدور ہوجاتا ہے، البتہ جب کسی کو متنبہ کردیا گیا کہ یہ کام دہشت وخوف کے زمرہ میں آتا ہے اس کے باوجود وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو پھر گویا اسنے بالارادہ خوف ودہشت پیدا کی جس کی وجہ سے وہ دہشت وخوف پھیلانے کے زمرہ میں آئے گا۔

اسلام ایسے امن وسلامتی کا داعی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے، دنیا میں بھی وہ امن کی دعوت دیتا ہے چاہے طرفین میں مذہبی اخلاق ہی کیوں نہ ہو۔ خوف ودہشت (ارہاب وارعاب) پھیلانا تا کہ دوسروں پر ظلم وزیادتی کی جائے حرام قرار دیتا ہے، اور

اسلام میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے، نیز اس کے لیے سخت سزائیں بھی تجویز کی گئیں ہیں بشرطیکہ واقعتاً یہ ثابت ہوجائے کہ یہ دہشت وخوف پھیلانے کی شرارت ظلم وزیادتی کے زمرہ میں آتی ہے۔

ہاں اسلام نے خوف ودہشت کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے لیکن اس کے شرعی اصول اور ضوابط ہیں وہ یہ کہ صرف ظالم کو سزا کے طور خوف زدہ کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بھی اتنا ہی ہو جتنی اس کے لیے سزا میں گنجائش ہے،اور ایسا کرنا فطری امر ہے تاکہ انسانی جانوں کا دفاع کیا جاسکے، ظالموں کے ظلم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کی جاسکے، بالخصوص ایسے کمزور افراد کی جوخود اپنا دفاع نہیں کرسکتے، اور یہی وہ تعبیر ہے جس کو اسلام میں ''جہاد'' (اگر کوئی لفظ جہاد اور اس کے مشتقات میں غور کرے تو اس کو یقیناً معلوم ہوگا کہ جہاد کا مفہوم یہ نہیں کہ ابتداء ہی کسی پر حملہ کیا جائے بلکہ کسی واقع شدہ معاملہ کے بعد اس کے وقوع ہوتا ہے) یا قتال فی سبیل اللہ کا نام دیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ کمزور اور ضعفاء اور جو لوگ اپنے دفاع سے عاجز ہیں ان سے ظلم کو ختم کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾ (النساء: ۷۵)

''اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد نہ کرو، اور کمزوروں کی وجہ سے جن میں سے کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں، اور کچھ بچے ہیں جو دعا کررہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے باہر نکالیئے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور ہمارے لیے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجیئے، اور ہمارے لیے غیب سے کسی مددگار کو بھیجئے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا:

''اے میرے بندو ! میں نے اپنی ذات پر بھی ظلم کو حرام کیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے پس آپس میں ظلم نہ کرو۔''❶

آیت کریمہ اور حدیث نبوی کے بعد اب اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں رہ جاتی کہ مسلمانوں پر اپنی غیر مسلم رعایا (یعنی اہل ذمہ) موجودہ اصطلاح میں غیر مسلم اقلیت کے دفاع میں جہاد کرنا بھی ضروری ہے۔❷

دوسرے الفاظ میں جہاد اسلام میں ظلم کے لیے نہیں بلکہ جائز دفاع کے لیے ہے جس کی اجازت دنیا کے تمام مروجہ قوانین میں دی گئی ہے خواہ وہ جمہوری ممالک کے قوانین ہوں یا غیر جمہوری، بلکہ تمام ممالک اس کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی دفاعی قوت مضبوط ہو ،فوج طاقتور ہو، اسلحہ قوی اور جدید نوعیت کا ہو وغیرہ۔

جائز دفاعی تیاری (ارعاب) اور ظالمانہ دہشت کے مابین کس طرح فرق کیا جائے؟:

گزشتہ بیان سے واضح ہوگیا کہ دہشت اور ارعاب کو ظالم بھی استعمال کرتا ہے اور مظلوم بھی اس (دہشت وتخویف) کا سہارا لیتا ہے،اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کس طرح فرق کریں کہ کون دہشت وارعاب کو ظلماً استعمال کررہا ہے اور کون مظلوم اپنے دفاع کے لیے یا دوسرے مظلوموں کے دفاع کے لیے اس اصطلاح کو استعمال کررہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اس باب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جس نے ابتداء کسی دوسرے کے خلاف دہشت وتخویف (ارہاب وارعاب) استعمال کیا وہی ظالم ہے، اور جو شخص دفاع میں دہشت وتخویف کا استعمال کررہا ہے وہ مظلوم ہے، اور جو شخص ظالم کی تائید مادی یا معنوی اعتبار سے کررہا ہے وہ بھی اسی کے حکم میں داخل ہے جو ظلماً دہشت کا استعمال کررہا ہے، اور جو شخص مظلوم کی حمایت ونصرت کررہا ہے وہ مظلوم کے دفاع کے حکم میں ہے۔

---

❶ صحيح مسلم كتاب البر والصلة.

❷ ابن قدامه مقدسی، ابن تیمیه حرانی، شیرازی وغیره۔

یہ بات درست ہے کہ اس کا تعیین کرنا کہ کون دہشت کو ظلماً استعمال کررہا ہے اور کون دفاعاً تمام حالات میں ممکن نہیں مگر پھر بھی بہت سے حالات میں اس کا تعین کرنا واضح ہوتا ہے، چاہے ظالم کا پلڑا مظلوم کے مقابلہ میں بھاری ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ جب یہ امر مشکل ہوجائے کہ کس نے ارہاب (دہشت) کی ابتدا کی ہے تو پھر اس کی تمیز کے لیے ایک دوسرا طریقہ ہے وہ یہ کہ طرفین میں اصلاح کی کوشش کی جائے، اب اُن میں سے جو بھی عادل ومنصف فیصلہ کرنے والے حکموں کے فیصلہ کو رد کرے گا وہی ظالم سمجھا جائے گا چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۝﴾ (الحجرات : ۹)

''اگر مسلمانوں میں دوگروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کردو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہوجائے، پھر اگر رجوع ہوجائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو، اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔''

ظلماً ارہاب اور ارعاب (دہشت وتخویف) کی کبھی یہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ ہم ایک شخص کو بلا کسی دلیل اور ثبوت کے متہم ٹھیراتے ہیں، یا کسی گروپ یا جماعت یا قوم پر الزام لگادیا جاتا ہے، اسلام اس کی بھی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ بلا کسی ثبوت کے کسی کو متہم قرار دیا جائے، اسلام میں شرعی حدود ہیں جن سے تجاوز کرنا جائز نہیں، چنانچہ جس کو تہمت لگائی جائے وہ یقینی ثبوت کے ساتھ ہو، نیز سزا بھی جرم کے مطابق ہی ہو وہ باغی کی کمزوری اور طاقت سے تبدیل نہ ہو اس طرح پر کہ اگر ظالم ضعیف ہے یا وہ قریبی اور دوست نہیں ہے تو سزا سخت ہو،

اور اگر ظالم طاقتور ہے یا قریبی ہے یا ظالم سے کوئی مصلحت وابستہ ہے تو اس کی سزا برائے نام ہو جائے۔

اللہ تعالی تمام حالات میں اس بات کا حکم فرماتے ہیں کہ دامنِ عدل کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور ہر حال میں عدل وانصاف قائم کرو۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (المائدہ : ۸)

''اے ایمان والو !اللہ تعالی کے لیے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو، اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو، کہ وہ تقوی سے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرو، بلا شبہ اللہ تعالی کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔''

الغرض ان واضح اسلامی تعلیمات وہدایات کے باوجود بعض لوگ جو اپنے کو مسلمان کہلاتے ہیں ظلماً ارہاب اور دہشت کی کارروائی کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ ہر ملک اپنے باشندوں کی صحیح نہج پر تربیت کرتا ہے تاہم پھر بھی ایسے افراد ہر ملک میں موجود ہوتے ہیں جو قانون کے دائرہ سے نکل کر دہشت کی کارروائیاں کرتے ہیں، اور پھر جیل کی کوٹھریوں میں محبوس اور قید وبند کی صوبتیں برداشت کرتے ہیں، تاہم ایسے لوگوں کی وجہ سے پورے ملک یا پوری قوم کو دہشت گرد قرار دینا، یا یہ کہنا کہ فلاں ملک دہشت گردی پھیلا رہا ہے یا دہشت گردی کی تربیت دے رہا ہے؟ ایک امریکی رپورٹ میں یہ بات شائع ہوئی ہے کہ (۱۷۵) دہشت گردی کے واقعات ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۹۶ء کے دوران خود امریکی ریاستوں میں ہوئے ہیں، جن کے کرنے والے اکثر نصاری (عیسائی) تھے۔ دوسرے نمبر پر یہود، پس کیا اس رپورٹ کی بنیاد پر یہ کہنا درست ہے کہ تمام

نصاری (عیسائی) دہشت گرد ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگیا۔لہٰذا معدودے چند لوگوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کی بنا پر پوری قوم یا اکثر لوگوں کو دہشت گرد کہنا یقیناً انصاف نہیں۔ اگر بعض نام نہاد مصنف ڈیموکریٹک حکومتیں ان حکومتوں کی مدد کریں جو مذہبی انتہا پسندی کی آڑ میں وہاں کے اصلی باشندوں کو ان کی زمینوں سے نکال دیں تو کیا اس صورت میں یہ کہنا جائز ہوگا کہ ڈیموکریٹک حکومتیں ظالمانہ دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں؟ اگر ایک طاقتور ڈیموکریٹک ملک دوسرے کمزور ملک پر حملہ کر دے تو کیا اب بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب ڈیموکریٹک ملک ایسے ہی ہوتے ہیں؟

اسلام میں ظالمانہ دہشت گردی کا علاج کیا ہے؟:

اسلام نے ظالمانہ دہشت گردی کا علاج تین بنیادی طریقوں سے کیا ہے:

ا۔ **اولاً**:......بچپن ہی سے بچوں کی تعلیم وتربیت اس طرح کرنے کی ذمہ داری ڈالی کہ بچہ کو بچپن ہی سے ظلم وزیادتی کا حرام ہونا معلوم ہو، اور عدل وانصاف کی ترغیب اور اس کی مدد ومعاونت کا شوق بچہ کے دل ودماغ میں بسایا جائے۔

۲۔ **ثانیاً** :......اُن اسباب کا ازالہ کیا جائے جو دہشت اور ظلم وزیادتی کو ہوا دیتے ہیں، اس طرح پر کہ حقوق کو محفوظ کیا گیا، اور حکومت کو عدل وانصاف کا پابند بنایا گیا، نیکی اور بھلائی اور خیر خواہی اور تقوی کے کاموں میں باہم تعاون کی ترغیب دی گئی، عادلانہ وسائلِ زندگی فراہم کرنے کا حکم دیا گیا، اس تناظر میں جب ہم دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطابؓ کا عمل دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ آپ نے قحط کے زمانہ میں چور کی ہاتھ کٹنے کی سزا نافذ ہونے سے روکدی، اور کچھ غلاموں نے اونٹنی چوری کی اور اس کو ذبح کرلیا تاکہ اس سے اپنی بھوک مٹائیں، آپؓ نے ان کو معاف کردیا اور اُن غلاموں کے آقا کو بلاکر سرزنش کی، اس لیے کہ وہ اُن کو بھوکا رکھتا تھا، اور مسلمانوں کے بیت المال سے یا عمومی فنڈ سے اونٹنی کی قیمت ادا کی۔ [1]

[1] مسند الشافعی ج ۱/ ۲۲٤.

یہاں ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ جس سے دہشت گردی کا صدور ہو رہا ہے قبل اس کے کہ اس کے خلاف حکم نافذ کیا جائے ، دہشت گردی کے اسباب کو جاننا چاہیے پھر اُن اسباب کے ازالہ کی کوشش کی جائے نہ یہ کہ صرف دہشت گردی کو تو کچلا جائے مگر جو اسبابِ دہشت گردی ہیں اُن سے صرفِ نظر کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض مظلوموں کی جانب سے کوئی دہشت گردی کی کارروائی ہوتی ہے جس میں کچھ بے گناہ مارے جاتے ہیں اس پر تو ہم واویلا مچاتے ہیں مگر اُس دہشت گردی سے ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو اِن مظلوموں کے خلاف ہو رہی ہے جس میں ہزاروں بے گناہوں کی جان چلی جاتی ہے۔

بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ملک میں کوئی دہشت گردی کی کارروائی ہوئی تو وہ ملک طعن و تشنیع تو کرتے ہیں مگر اس دہشت گردی کے اسباب وعوامل پر غور نہیں کرتے اور ان سے غفلت برتتے ہیں۔ بسا اوقات کوئی ملک کسی ظلم و دہشت گردی میں معاون و مددگار ہوتا ہے جس کے ردِ عمل میں اُس ملک میں کوئی دہشت گردی کی کارروائی کی جاتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ممالک دہشت گردی ختم کرنے کے حل تلاش کرنے میں ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے خود ارہاب و دہشت گردی کو مزید تقویت ملتی ہے بلکہ اس کو غذایت فراہم ہوتا ہے، اور وہ ملک اُس حل سے غافل رہتا ہے جو اس کے اختیار میں ہے، یا اُن اسباب سے تجاہل برتتا ہے جو دہشت گردی کا مصدر ہیں۔

بعض ملکوں کے حکمراں ایسی قراردادیں پاس کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں جن کی بنیاد ہی غلط معلومات پر مبنی ہوتی ہے جن کو ملک کی قوتوں کے مراکز فراہم کرتے ہیں (مثلاً بعض محکمہ خفیہ معلومات (سی آئی ڈی) یا وزارتِ دفاع، یا دوسرے ممالک کے لیے کام کرنے والے ایجنٹ وغیرہ) جبکہ اس سلسلہ میں بہتر یہ ہے کہ ان محکموں کے قائدین و ذمہ داران کو حقائق تک پہنچنے کے لیے خوب تحقیق و تدقیق سے کام لینا چاہیے ،ان معلومات و خبروں کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے جو غیر جانبدار یا ادھر اُدھر کے غیر معتبر مآخذ و مصادر سے شائع

ہوتی ہیں، نہ یہ کہ صرف اُن محدود مصادر اور خبروں پر اعتماد کیا جائے جو بسا اوقات قصداً یا بلا قصد گمراہ کن ہوتی ہیں، اس لیے کہ بعض دشمن طاقتیں دباؤ کے لیے مختلف وسائل اختیار کرتی ہیں تا کہ من مانے طریقہ پر قراردادیں منظور کرائیں، یا اُن کی من چاہی کارروائیاں پوری ہوں، اس معاملہ میں وہ منافی اخلاق اور نہایت گرے ہوئے خسیس طریقے استعمال کرتے ہیں اور قرارداد پاس کرنے والوں کو غلط معلومات فراہم کرتے ہیں، اُن کو مال کے ذریعہ خریدتے ہیں حتی کہ ذمہ داران کو ایسے مسائل میں مبتلا کر دیتے ہیں جو اُن کی رسوائی کا سبب بنیں، یا ایسے سماجی ومعاشرتی تنظیموں کے جال میں الجھا دیتے ہیں کہ اس سے نکلنا ان کے لیے دشوار ہو، اور ان تنظیموں کے ذریعہ ذمہ داران کو دھمکیاں دلاتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو جرائم پر ابھارتے ہیں۔

یہاں پر ہر قوم کے باشعور طبقہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کی قیادت کی رہنمائی کریں اور اپنی قوم کی بھی صحیح رہنمائی کریں جو سازشوں اور مکروفریب کے دام میں آسانی پھنس چکی ہوتی ہے، یا قوم کو اس طرح کے حکمران غیر عقلی وغیر منطقی قراردادوں سے مجبور ولاچار کر دیتے ہیں۔

۳۔ **ثالثا**:......تیسرے یہ کہ ثبوت فراہم ہونے کے بعد مجرمین کے لیے سخت سزائیں مقرر کی جائیں، اور قاضی وحاکم کو یہ اختیار ہو کہ ذاتی اعترافات کو رد کر دے، اس لیے کہ بہت سی سزائیں جو بے گناہوں کو دی جاتی ہیں اس میں تحقیق وتدقیق کے پہلو کی کمزوری کو دخل ہوتا ہے، یا پھر انتقامی جذبات اس میں کارفرما ہوتے ہیں جو قانونی حدود کو پار کر جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں دہشت گردی کو مزید فروغ ملتا ہے جس کا سبب محض انتقام کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

کیا قرآن کریم کے مدارس بغض وحسد اور انتہا پسندی پیدا کرتے ہیں؟:

بلا شبہ قرآن کریم ساری دنیا میں امن وسلامتی کا داعی ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دیئے گئے قرآن کریم کے متعدد حوالوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے، اور یہ امن وسلامتی جس کی قرآن کریم نے دعوت دی ہے نہ صرف یہ کہ دنیاوی زندگی سے متعلق ہے بلکہ اخروی امن

وعافیت کو بھی شامل ہے، اس میں دوسرے کے حقوق کی ادئیگی کی بھی ترغیب ہے چاہے وہ جس مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

جو بھی قرآن کریم میں صحیح فہم کے ساتھ کے ساتھ نظر ڈالے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اخلاق کو اپنائے اور تمام لوگوں کے ساتھ حسن سلوکی سے پیش آئے، بلکہ اُن کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے، اور سارے انسانوں تئیں دنیا وآخرت کی سعادت اور فلاح وبہود اور خیر خواہی کا جذبہ رکھے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○﴾ (الممتحنه : ۸،۹)

''اللہ نے اس بات سے منع نہیں فرمایا کہ تم اُن لوگوں سے بھلائی اور انصاف کا معاملہ کرو جنھوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں قتال نہیں کیا اور نہ تم کو تمہارے شہروں سے نکالا، بلا شبہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں، صرف اُن لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالی تم کو منع فرماتے ہیں جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو (اور اگر نکالا نہ بھی ہو تو) تمہارے نکالنے میں مدد کی، اور جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے تو وہی لوگ ظالم ہوں گے۔''

قرآن کریم میں ہی صلہ رحمی وقرابت داری اور والدین کے حقوق کی ادائیگی سے متعلق بھی حکم دیا گیا ہے چاہے وہ قرابت دار اور والدین غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا

لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۝﴾ (العنکبوت : ٨)

''اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اگر وہ دونوں تم پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تم ایسی چیز کو میرا شریک ٹھیراؤ جس کی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں تو تم اُن کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے، سو میں تم کو تمہارے سب کام بتلاؤں گا۔''

نیز ارشا فرمایا:

﴿وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡلِىۡ وَ لِوَالِدَيۡكَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ۝ وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۝﴾ (لقمان : ١٤، ١٥)

''اور ہم انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میرے اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھیرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو، تو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ اچھائی وبھلائی کا سلوک کرنا۔ اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اس کے رستے پر چلنا پھر تم کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کرتے ہو میں سب سے تم کو آگاہ کردوں گا۔''

قرآن کریم میں یہ بات فرما دی گئی ہے کہ اسلام انسان کی عزت وکرامت کی حفاظت کی تعلیم وترغیب دیتا ہے، اور ایسی عزت وشرافت پر ابھارتا ہے جس میں بناوٹ اور غرور کا

شائبہ تک نہ ہو، اور ایسی طاقت وقوت کی مدح وستائش کرتا ہے جس میں دوسروں پر زیادتی نہ ہو۔

قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی کاشوں اور جدوجہد کا تذکرہ ہے اور اُن عداوتوں اور دشمنیوں کا بھی ذکر ہے کہ جو آپ ﷺ کو دعوت کی راہ میں منکرینِ دعوت سے پہنچیں، اور پھر کس طرح آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ نے تیرہ سال تک تکلیفوں پر صبر کیا، تب جا کر اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو جان کے دفاع کے لیے جہاد کا حکم فرمایا اور ظالموں سے ظلم کا بدلہ لینے کی اجازت فرمائی اس طرح پر کہ ظلم کا بدلہ لینے میں بھی برابری کا معاملہ ہو یعنی ظالم جتنی سزا کا مستحق ہے اتنی ہی اس کو دی جائے زیادہ سزا دی گئی تو یہ زیادتی ہوگی جس کی اسلام میں اجازت نہیں۔

دنیا میں بہت سی جنگیں چھڑی ہیں جن کی بنیاد عصبیت یا مذہبی چشمک یا سیاسی کشمکش تھی، اِن ہونے والی جنگوں میں طرفین نے دہشت وتخویف کے بہت سے طریقے اختیار کیے، مثلاً: زیادتی، تباہی، جانوں پر جسمانی روحانی اور ذہنی ایذائیں وغیرہ وغیرہ۔

تو کیا یہ سب ہی دہشت گرد کے زمرہ میں آتے ہیں، یا اسباب ودوافع کا اعتبار کیا جائے گا؟ کہ کون سی تخویف اور دہشت کی کوشش ظلماً ہے اور کونسی دفاعاً؟

ہر ملک میں فوجی وسیکورٹی ٹریننگ کے مراکز ہوتے ہیں جن میں فوج اور سیکورٹی باڈی کو جدید آلاتِ حرب کی تربیت اور ٹریننگ دی جاتی ہے یہ آلاتِ حرب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ کسی بھی جگہ بآسانی تباہی وبربادی پھیلائی جاسکتی ہے، جو ممالک مادی اعتبار سے جتنے ترقی یافتہ ہیں اُن کے پاس اتنے زیادہ تباہی پھیلانے والے اور نئی ٹیکنالوجی سے لیس ہتھیار اور آلاتِ حرب موجود ہیں، اور یہی ممالک پھر دوسرے درجہ کے ملکوں وقوموں کو ہتھیار فروخت کرتے ہیں، یہ جدید ٹیکنالوجی اور ترقی یافتہ ہتھیاروں سے لیس ممالک ہی اس پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ جدید ترین اسلحہ جو زیادہ مہلک اور تباہی پھیلانے والا ہے موجود ہے، اور ان کے پاس ایسی طاقتور ترین فوجی طاقت وقوت ہے

جس کی نظیر نہیں ، پس کیا ہمارا یہ کہنا بجا ہوگا کہ اِن سب تربیتی اور ٹریننگ مراکز اور جنگی کیمپوں کو بالکل بند کر دیا جائے ؟

کیا تمام ہی مما لک ارہاب ودہشت گردی کو ہوا دے رہے ہیں؟ اور کیا تمام مما لک جو اپنی فوجی طاقت وقوت بڑھاتے ہیں اور اپنی دفاعی قوت کو مضبوط کرتے ہیں کیا ہم اُن کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں یہ مما لک دہشت گردی کو تقویت پہنچا رہے ہیں اور اس کو بڑھاوا دے رہے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہی ہوگا ، اس لیے کہ ہر انسان کو حق ہے کہ جب اس پر ظلم ہو یا کسی زیادتی کا اسے سامنا کرنا پڑے تو وہ اپنے دفاع کے لیے تیاری کرے ، اور تمام قوانین خواہ وہ خدائی قوانین ہوں یا انسانوں کے وضع کردہ سب ہی انسان کو اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات ، مال ،عزت اور دین کے لیے دفاعی تیاری کرے ۔

اگر قرآن کریم کی تعلیم کینہ ونفرت اور انتہا پسندی پیدا کرتی ہے ،اسلیے کہ اس میں ابتداء اسلام میں مسلمانوں اور غیروں میں جو کشمکش اور عداوت ودشمنیاں رہیں وہ مذکور ہیں جس سے نفرت وکینہ پیدا ہوتا ہے ،تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات تو پھر تمام قوموں کی گزشتہ تاریخ پر بھی صادق آتی ہے ،تو کیا تمام قوموں کو اس سے روک دیا جائے کہ وہ تاریخ نہ پڑھائیں ، اس لیے کہ اس میں گزشتہ باہمی یا غیروں کے ساتھ ہونے والی جنگوں کا ذکر ہے جس سے کینہ اور نفرت وعصبیت پھیلتی ہے ، لہٰذا کسی قومی تاریخ کو نہ پڑھایا جائے تو کیا یہ بات معقول ہوگی ؟ اسی طرح عالمی جنگوں کی فلمیں اور ویڈیو وآڈیو کیسٹس ہیں ،اسی طرح تخیلاتی فلمیں ہیں جو مختلف قوموں اور گروہوں یا ایک ہی ملک کے باشندوں کے مابین ہونے والی جنگوں کی تصویر پیش کرتی ہیں ،تو کیا اِن سب پر پابندی لگادی جائے کہ یہ فلمیں اور کیسٹس انتہا پسندی اور نفرت کی آگ کو بڑھا رہی ہیں اور اُن ملکوں اور قوموں یا جماعتوں میں دوریاں پیدا کر رہی ہیں جن کی باہمی لڑائی کا کردار ان میں پیش کیا گیا ہے؟ حالانکہ یہ فلمیں اور کیسٹس اُن واقعات اور تاریخی حوادث کو بیان کرتی ہیں جو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں میں بھی ایسی تعلیمات ہیں جن کو اگر

سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تعلیمات ظالمانہ دہشت گردی کو فروغ دے رہی ہیں، مثال کے طور پر عہد قدیم (Old Testament) میں مذکورہ ہے:

''جب تمہارا مالک تمہارا معبود تمہیں زمین میں لے جائے اور تم زمین میں داخل ہوجاؤ، تو تم اس کے ملک بن جاؤ، اور اپنے سامنے سے بہت سی قوموں کو لتاڑ دو......سات قومیں تم سے زیادہ ہیں اور عظیم ہیں جن کو تمہارے رب نے تمہارے سپرد کر دیا ہے پس تم ان کو محروم کردو، اُن سے کوئی عہد و پیمان نہ کرو، نہ اُن پر رحم کرو، اور اُن سے بیاہ شادی کرو۔'' ❶

ایک جگہ مذکور ہے:

''پس اب بچوں میں سے ہر ایک لڑکے کو قتل کردو، ہر ایسی عورت جس کو مرد کے پاس لیٹنے کا شعور ہوجائے (یعنی بالغہ) اس کو قتل کردو، البتہ عورتوں میں سے وہ تمام لڑکیاں جن کو کسی مرد کے پاس لیٹنے کا ابھی شعور نہیں آیا (یعنی غیر بالغہ) اُن کو اپنے لیے زندہ رکھو۔'' ❷

عہد جدید سے بھی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

''وہ میرے دشمن ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ میں اُن پر امیر بنوں، اُن سب کو یہاں میرے سامنے لا کر قتل کردو۔'' ❸

پس کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ مقدس کتابیں ظلم ودہشت گردی کو فروغ دے رہی ہیں؟ یا یہ کہ ان مقدس کتابوں سے ایسی نصوص کو نکال دیا جائے؟ یقیناً اس کا جواب بھی نفی میں ہی ہوگا اس لیے کہ اِن نصوص کو اُن کے سیاق وسباق کے ساتھ ہی سمجھنا لازم وضروری ہے۔

---

❶ الكتاب المقدس: العهد القديم، التثنية، ١٢/١/٧، سفر التثنية، ٢٠: ١٨.

❷ الكتاب المقدس: العهد القديم، الأعداد، ٣١: ١٧، ١٨.

❸ الكتاب المقدس: العهد الجديد، لوقا، ١٩، ٢٦، ٢٧.

فصل ہفتم:

انتہا پسندی اور شریعتِ اسلامی کی تطبیق

ایک سمجھ دار انسان اس بات کو سمجھتا ہے کہ ''انتہا پسندی'' کے لفظ کا تعلق کسی کی ذات کی حیثیت سے ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ کسی کے حق میں ہوسکتا ہے کہ صحیح ہو، اور کسی دوسرے شخص کے حق میں ہوسکتا ہے کہ اعتدال پر محمول ہو، لہٰذا پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ ''انتہا پسندی'' کا معیار کیا ہے؟ چنانچہ بسا اوقات ایک ہی ملک میں انتہا پسندی کا مفہوم مختلف اوقات میں بدلتا رہتا ہے، مثلاً ایک وقت امریکہ میں وہ تھا جب وہاں کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) نے قاتل عمد (جان کر قتل کرنے والے) کی سزائے موت کی مخالفت کی تھی، اور یہ کہا تھا کہ یہ ایسی سزا ہے جس میں انتہا پسندی پائی جاتی ہے، پھر ایک وقت وہ آیا جب امریکہ کی اسی عدالتِ عالیہ نے اس پھانسی کی سزا کو دوبارہ بحال کر دیا اور کچھ تبدیلیوں کے ساتھ پھر اس قانون کو تمام صوبوں میں جاری کر دیا تاکہ پھانسی کی سزا کی تطبیق میں کچھ توسع سے کام لیا جائے (US Department 0f justice) تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اب امریکی عدالت انتہا پسند ہوگئی۔

ہر مسلمان دلائل کی روشنی میں جانتا ہے کہ اسلامی تشریع الٰہی خدائی تشریع ہے جو اس کے بہ نسبت زیادہ وسعت وصلاحیت رکھتی ہے جو تشریع یا قانون سازی انسانی اجتہادات کی روشنی میں وجود میں آئی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالی کی ذات عالی ساری انسانیت کی خالق ہے اور وہ مالک وخالق جانتے ہیں کہ انسان کے لیے کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں۔

یورپ کے عہد ترقی میں بعض انسانی تجربات نے اس بات کو ثابت کیا کہ بے شمار اسلامی قوانین میں حقوق انسانی اور ان کی صلاح کی استعداد زیادہ ہے اور اس میں متعدد اور

متعارض قوانین میں توازن پیدا کرنے کی صلاحیت جب کہ ان پر عمل کیا جائے بے حد مثالی ہے۔ اسی لیے اس دور میں یورپی معاشروں میں ان اسلامی احکام سے استفادہ کرنے میں کوئی سستی نہ کی۔

جب کسی ملک کی ساری قوم یا قوم کی اکثریت نے اسلام کو دین کے طور پر قبول کرلیا، اور یہ تسلیم کرلیا کہ اسلامی نظامِ حیات اور قانونِ زندگی خدائی اور الٰہی ہے جو قوم کے آپسی افراد کے تعلقات یا قوم کے دوسری مختلف اقوام سے تعلقات کی تحدید وتعیین کو بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے تو پھر اُس ملک حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم کی انفرادی واجتماعی خصوصی وعمومی زندگی میں شریعتِ اسلامیہ کو نافذ کرے، اس لیے کہ ہر ایسی قوم کو جو آزاد ہے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مناسب حال شریعت کو اختیار کرے چاہے وہ اقوامِ متحدہ کی رکنیت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اسلامی تشریع ایک وحدت ہے جو تجزی کو قبول نہیں کرتی۔

مذہب اسلام میں جہاں بعض جرائم کی سزا کے سلسلہ میں سخت موقف اختیار کیا گیا ہے اور اُن جرائم کی واضح سزائیں مقرر کی ہیں کہ جن کے نفاذ میں کسی قسم کی کوتاہی کو برداشت نہیں کیا گیا وہیں یہ بات بھی ضروری قرار دی گئی ہے کہ وہ جرائم صحیح طریقے پر ثابت بھی ہوں چاہے اس میں سخت کارروائیاں ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔

نیز مذہب اسلام ہی کوئی واحد اور پہلا مذہب نہیں جس میں یہ سزائیں جاری کی گئیں ہوں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انتہا پسندی پر مبنی ہیں، بلکہ سابقہ شریعتوں میں بھی یہ سزائیں موجود تھیں مثلاً یہود اور نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں بھی یہ سزائیں مذکور ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اب سیکرلرازم کے دور میں ان سزاؤں پر عمل درآمد کرنا موقوف کر دیا گیا ہے۔

کسی عقل مند کو اس بات میں شک نہیں ہوسکتا کہ ایک صالح نظام حکومت سزاؤں کے نظام سے خالی نہیں ہوسکتا جن کو ان لوگوں پر لاگو کیا جائے جو لوگوں کے امن عامہ وخاصہ کو برباد کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ اسلامی شریعت میں سزاؤں کی نوعیت صرف

بدلہ لینا یا انتقام لینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ انسانی تربیت اور اس کے اخلاق وکردار کی اصلاح وتربیت کا نہایت مؤثر ذریعہ ہیں۔

بعض اسلامی حکومتوں کے کاموں کو کیوں انتہا پسندی کا لقب دیا جاتا ہے؟:

ایسی حکومت جو اسلامی شریعت کو نافذ کرتی ہو (جس وہ قوانین بھی ہیں جن کو بعض انتہا پسندی تصور کرتے ہیں) جیسا کہ دوسری حکومتیں یہ حق رکھتی ہیں کہ وہ اپنی قوموں کے لیے ایسے قوانین نافذ کریں جن سے اُن کی ساری عوام یا اکثریت راضی ہوا ور وہ قوانین اس کے منشا کے مطابق ہو، پس جب کسی مسلم ملک کی عوام یا عوام کی اکثریت اگر اسلام کو عقیدہ اور نظام کے اعتبار سے اختیار کرلے تو اس کو انتہا پسندی قرار دینے کے لیے یہ کافی نہیں:

۱۔ کوئی بھی شخص چاہے وہ اسلام کے بارے میں کچھ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اور یہ شخص عام انسانی اقدار و اخلاق کا پاسدار ہو یا بالکل آزاد ہو رائے زنی کرے اور اسلام کے کسی حکم کو انتہا پسندی قرار دے۔

۲۔ یا کوئی شخص اسلام کے کسی حکم یا قانون کو عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی عملداری یا اُن کی اسلامی احکام کی تطبیق کی روشنی میں دیکھ کر انتہا پسندی کا الزام تراشنے لگے۔

کسی بھی اسلامی حکم کو یا قانون کو انتہا پسندی کا الزام کا فیصلہ دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی نصوص اور معتبر احادیث شریفہ یا اِن دونوں مأخذوں سے اہل علم اور کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ کے ماہرین کے استنباط کو سامنے رکھا جائے پھر اس قانون یا حکم پر انتہا پسندی یا اعتدال کا نام رکھا جائے۔ اس لیے کہ عصرِ حاضر میں میں اسلامی مما لک میں رائج احکامِ شرعیہ کی تطبیق کو انتہا پسندی قرار نہیں دیا جاسکتا، اور نہ عصرِ حاضر کے اسلامی ملکوں کے حالات کو اسلام کے ابتدائی دور سے موازنہ کیا جانا درست ہے، چنانچہ عصرِ حاضر کو عہدِ نبوی یا خلفائے راشدین کے عہد یا اس کے قریبی زمانہ کی اسلامی حکومتوں کے عہد سے بھی سے موازنہ کرنا کسی طرح درست نہیں۔

یہ بھی ایک طبعی امر ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ اسلامی حکومت حالاتِ حاضرہ کو پیش

نظر رکھتی ہے جس میں کسی کا دنیا سے کٹ کر رہنا ایک مستحیل امر ہے، موجودہ دور میں معاشرہ میں ایسی دل لُبھانے والی اور انسان کو کھینچنے والی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے کہ ایک مسلمان کے لیے مشکل ہوگیا ہے کہ وہ تمام حالات اور تمام امور میں شریعتِ اسلامی کی تطبیق دے سکے، اور اسلام کے احکام کی تطبیق کا ایک اچھا نمونہ پیش کرسکے، اسی طرح اسلامی حکومتیں بھی اسلام کی تطبیق اسی انداز سے کرتی ہیں جتنا اُن کے اندر اسلامی احکام کی پاسداری ہوتی ہے یا جتنا عوام میں اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کے جذبات ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خدائی احکامات سے باہر نکل جائے یا اُن سے تجاہل اختیار کرے، کیونکہ اسلامی احکامات کا ثبوت قطعی اور دلالت بھی قطعی یا مشابہ قطعی ہے۔

ایک اسلامی حکومت سزائے موت کے قانون کو کیوں نافذ کرتی ہے؟

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝﴾ (البقرة: ۱۷۸)

"اے ایمان والو! تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین کے بارے میں، آزاد آدمی آزاد کے بدلہ میں، اور غلام غلام کے بدلہ میں، اور عورت عورت کے بدلہ میں، ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے معافی ہوجائے (تو مدعی کے ذمہ) معقول طور پر (خوں بہا کا) مطالبہ کرنا اور (قاتل کے ذمہ) اچھے طریقہ سے اس کے پاس پہنچادینا ہے، یہ (قانون دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف ہے اور رحمت ہے، پھر جو شخص اس کے بعد زیادتی کرے، تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا۔"

کسی شرعی وجہ کے بغیر جان بوجھ کر کسی کو مار ڈالنا کس قدر گناہ ہے اس کو رب تعالیٰ نے

اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدة : ٣٢)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی شخص کو کسی جان کے بدلہ کے بغیر یا بغیر زمین میں فساد کے جو اس نے پھیلا ہو قتل کرے گا تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا، اور جس شخص نے کسی دوسرے شخص کو بچالیا تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا۔''

پس اگر کوئی اسلامی حکومت پھانسی کی سزا نافذ کرتی ہے تو وہ اپنے اوپر ایک واجب قانون کو پورا کرتی ہے، اور اسلامی حکومت یا کسی بھی حکومت کے اختیار میں نہیں کہ وہ ایسے قوانین کو کالعدم قرار دے جس کو ساری عوام نے یا عوام کی اکثریت نے مل کر قانون قرار دیا ہو۔

گزشتہ آیتِ قرآنی سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام نے حق والے کے حق کی حفاظت کی ہے، اور حقدار کو اس کا حق پہنچایا ہے کہ عفو و درگزر کی ترغیب دے کر اس کو معاف کرنے کا پورا حق دیا، یہاں تک کہ قتل کے سلسلہ میں بھی اس کا وقوع ہوتا رہتا ہے کہ قاتل کی پھانسی سے پہلے مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کر دیتے ہیں، اور یہ معافی ایسے وقت ہوتی ہے جب قاتل کو اچھی خاصی عبرت حاصل ہو چکی ہوتی ہے۔

جمہوری ملکوں اور قومیت کی علم بردار نظامہائے حکومت میں بھی یہی بات عدل وانصاف کے دائرہ میں آتی ہے کہ حکومتِ وقت بھی اُن قوانین سے سرِ مو انحراف نہیں کرتی جن کو ساری قوم نے یا قوم کی اکثریت نے اپنے لیے اختیار کیا ہو، مثلاً کوئی بھی حکومت ایسا نہیں کرتی کہ وہ ایسے شخص کو اس کے حق سے دست بردار ہونے پر مجبور کرے جس کا مال چوری ہو گیا ہو اور چور مع چوری کردہ مال کے پکڑ لیا گیا ہو۔

شاید یہی وجہ تھی کہ عالمی مجلس امن نے ایسی سزا کی تائید کی جو جرم کے مطابق ہو، چنانچہ

کسی ایسے پورے ملک کے خلاف سزا کی اجازت دی جس کے کچھ افراد جرم میں براہِ راست ملوث ہوں یا وہ مجرموں کے معاون ہوں ، یہ اجازت ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثہ کے ضمن میں سامنے آئی ۔ اور یہ ایسی تہمت ہے جو ابھی تک محتاجِ تحقیق و تفتیش ہے کیونکہ ایسے متعدد دلائل ملے ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ یہ ایک گہری اور مخفی سازش تھی جس پر بے شمار لوگ آ گاہ نہ ہو سکے اور انٹیلی جنس کے متعدد محکمے اس کی حقیقت کا پتا نہ لگا سکے ۔ اگر عالمی مجلس امن کی اس انسانیت سوز قرار داد کا پھانسی کی اس اسلامی سزا کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ایک تو اسی کو ملتی ہے جس نے جرم کیا ہوتا ہے ، دوسرے متعدد ٹھوس دلائل وشواہد کے بعد یہ سزا دی جاتی ہے تو پھانسی کی یہ سزا مجلس امن کی قرار داد سے کہیں بڑھ کر مبنی بر انصاف ہوگی ۔ کیونکہ مجسل امن کی قرار داد فردِ واحد پر تہمت پر مبنی تھی یا ایک مختصر جماعت پر تہمت پر مبنی تھی لیکن اس کے نتیجہ میں ہزاروں معصوم بچوں ، بے گناہ عورتوں اور بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا یا پھر بُری طرح گھائل کر دیے گئے یا لا پتہ ہو گئے ۔

بہر حال پھانسی کی سزا ہی ایک ایسا کامیاب علاج ہے جس سے قتلِ عمد جیسے گھناؤنے جرم اور بے گناہوں پر بلا وجہ قتل وغارت گری جیسے عظیم گناہ پر قابو پایا جا سکتا ہے ، ہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کے جرم کی سزا کا فیصلہ کسی عادل ومنصف عدالت کے ذریعہ ہو ، جو تحقیق وثبوت کی روشنی میں اپنا فیصلہ سنائے ، جس کے بعد ضابطے اور اصول کے تحت پھر سزا پر عمل درآمد ہو ، مجرم کو سزا دیا جانا سے اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ایک مجرم یا بہت سے مجرموں کی ٹولی بے گناہوں کے قتل کے واقعات میں ملوث ہو ، یا معصوموں کا خون بہائے ۔

اس حقیقت کی تائید اس ارشادِ باری تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے:

﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرة: ۱۷۹)

''اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے اے عقل والو ۔''

بلاشبہ قصاص ایسے بہت سے معصوم لوگوں کو زندگی فراہم کرتا ہے جو مجرموں کے زیادتیوں اور اُن کے ظلم وستم کے شکار ہوتے ہیں ، بلکہ خود اُن مجرموں کے لیے بھی قصاص

میں زندگی کا پہلو ہے جو اپنی غیض وغضب کو دوسروں کو قتل کر کے ٹھنڈا کرتے ہیں ،ایسے مجرم بھی جب سزا کے نفاذ اور قانون کی بالادستی دیکھیں گے اور قتل کے بدلہ اُن کو پھانسی کا کڑوا گھونٹ پینے کا خیال آئے گا تو یقیناً وہ کسی کے قتل کے ارتکاب سے پہلے ہزار بار سوچیں گے اور قتل جیسے عظیم جرم سے باز رہیں گے اور اس طرح خود ان کی بھی زندگی باقی رہے گی۔

قانونِ قصاص سے اسلام نے بے گناہوں کی زندگی محفوظ کی ہے اور معاشرہ میں قصاص کے قانون سے خوف ودہشت پیدا کرنا مقصود ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص کسی بے گناہ کے قتل کی ہمت نہ کر سکے گا ، اور بالکل یہی وہ وجہ ہے کہ دنیا کی تمام حکومتیں چاہے وہ جمہوری نظام رکھتی ہوں ، یا سیکولرازم کی علمبردار ہوں سب نے مقامی اور عالمی پیمانہ پر اس قانون کو اپنے یہاں جاری کیا ہوا ہے۔

اسلام میں اس کی اجازت نہیں کہ جن سے مصالحت ہے اُن کو قتل کیا جائے ، یا بلا وجہ عام باشندوں کے امن کو تار تار کیا جائے اور اُن میں خوف ودہشت پیدا کی جائے ،اسی طرح اسلام میں مجرموں کی مدد کرنا بھی جرم کے زمرہ میں آتا ہے اور یہ بات بھی جرم سے کم نہیں ، اس لیے اسلام میں اس کی ترغیب دی گئی ہے کہ عالمی امن وسلامتی کی حفاظت کے سلسلہ میں تعاون وخیر سگالی کے جذبہ کو فروغ دیا جائے ،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾

(المائدة : ۲)

''اور نیکی اور تقوی پر باہم تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم وزیادتی پر آپس میں تعاون نہ کرو۔''

اسلام نے چور کی سزا ہاتھ کاٹنا کیوں مقرر کی ہے؟:

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝﴾ (المائدة : ۳۸)

''اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنی والی عورت پس اُن دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ اس کا بدلہ جو انھوں نے جرم کیا، اللہ کی طرف سے اُن کے لیے رسوائی ہے، اور اللہ غالب اور حکمت والے ہیں۔''

پس جب کوئی اسلامی حکومت کسی چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کرتی ہے تو وہ ایک ایسے واجب کو پورا کرتی ہے جو اس کے ذمہ تھا، اس لیے کہ اسلامی حکومت یا کسی بھی حکومت کے اختیار میں نہیں کہ وہ اُن قوانین کو معطل اور کالعدم قرار دے جن کو پوری قوم یا قوم کی اکثریت نے اپنے لیے اختیار کیے ہوں۔

اسلام میں ہر انسان کے حق کی حفاظت کی گئی ہے، بلکہ ہر مکلّف مخلوق کے حق کی حفاظت کا خیال رکھا گیا ہے خاص طور پر وہ حقوق جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور جن پر انسان کی سعادت اور اس کی زندگی کے امن وامان کا مدار ہے۔ جن کے بغیر ایک انسان راحت واطمینان کی زندگی نہیں گزارسکتا، چاہے وہ مال کی شکل میں ہو، یا جان کی، یا عزت کی۔ غرض انسان کی ہر ضرورت کی حفاظت کا خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یوم النحر (عید الاضحیٰ) کے دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! یہ کونسا دن ہے؟ عرض کیا گیا: حُرمت والا دن ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ شہر کون سا ہے؟ عرض کیا گیا: حُرمت والا شہر ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ عرض کیا گیا: حرمت والا مہینہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاد رکھو تمہارے خون، (یعنی جانیں) تمہارے اموال، تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں، جیسا کہ تمہارے آج اس دن کی حرمت، اور تمہارے اس شہر کی حرمت، اور تمہارے اس مہینہ کی حرمت۔ [1]

لہٰذا انسان کی ان مذکورہ چیزوں پر عمداً حملہ وزیادتی کے لیے ایسی خوفناک سزا ہونی چاہئے جس کی وجہ سے کوئی شخص ایسے جرم کے ارتکاب کی ہمت ہی نہ کرسکے۔

مثلاً چوری کے جرم ہی کو لیجئے کہ چور صرف چوری ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات وہ آسانی

[1] بخاری: کتاب الحج.

کے ساتھ چوری کرنے کے لیے قتل کے جرم کا بھی ارتکاب کرتا ہے، نیز چوری کے واقعات سے معاشرہ میں خوف ودہشت پیدا ہوتی ہے، کبھی چوری کی وجہ سے بے گناہ انسانوں کا قتل بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان یا مال کی حفاظت میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جو چوری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسلام نے زانی کی سزا کوڑے کیوں مقرر کی ہے؟:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِأَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَo﴾ (النور: ۲)

''زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد پس اُن میں سے ہرایک کو سوکوڑے مارو، اورتم لوگوں کو اُن دونوں پر اللہ تعالی کے معاملہ میں بالکل رحم نہ آنا چاہیے، اگرتم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیے۔''

پس اگر کوئی اسلامی حکومت زنا کاروں کو کوڑوں کی سزا دیتی ہے، تو وہ درحقیقت اپنے ذمہ ایک واجب کو پورا کرتی ہے، اور کسی حکومت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی پوری قوم یا قوم کی اکثریت کے اختیار کردہ قانون کو معطل اور کالعدم قرار دے دے۔

اگر ہم ایسے جنسی تعلقات کے نتائج کا جائزہ لیں جو کسی اصول وقوانین اور حدود وقیود کے بغیر وجود میں آتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تعلقات متعدد متعدی امراض، اور بے شمار معاشرتی برائیوں کو جنم دیتے ہیں، جن کے نتیجہ میں بے راہ روی عام ہوتی ہے، جرم کا ارتکاب عام ہوتا ہے، قبل از ولادت شکمِ مادر میں ہی جنین کو ماردیا جاتا ہے، میاں بیوی کے درمیان تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور خاندان کے خاندان ٹوٹ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اسی لیے اسلام نے جنسی تعلقات کے لیے شرعی اصول وضوابط متعین کیے، جن کے تحت

انسان اپنی طبعی ضرورت پوری کرسکتا ہے، لیکن ساتھ ہی اُس جنسی تعلقات کے نتیجہ میں آنے والی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا، تاکہ معاشرہ میں عدمِ توازن پیدا نہ ہو، اور حقوق کی حفاظت و پاسداری ہوسکے، بالخصوص بچوں کے حقوق کی حفاظت، اور اُن کے لیے اُن کے باپ سہارا بن سکیں، نہ یہ کہ صرف ماں پر اُن کا بوجھ ڈال دیا جائے، اس لیے کہ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ بچہ کے ماں اور باپ دونوں نے لذت اور استمتاع کیا تھا تو اب اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد کا حق بھی دونوں پر ہی عائد ہوتا ہے، ایسے معاشروں میں جہاں بے راہ روی عام ہے، اور بدکاری کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں آدمی کسی عورت سے خواہش پوری کرتا ہے اور پھر بڑے آرام سے اپنی راہ لے لیتا ہے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں اور ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار کرلیتا ہے، بالآخر عورت بیچاری ہی اُس بدکاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچہ کی پوری ذمہ داری نبھاتی ہے۔

لہٰذا وہ نعرے، اور وہ بلند بانگ دعوے اور وہ قوانین وہ سفارشات جو مرد وزن کے آزادانہ جنسی تعلقات کے پُر زور داعی وحامی ہیں وہ درحقیقت عورت ذات کا بدترین استحصال کررہی ہیں کہ مرد جس طرح چاہے اُسے بد سے بدتر طریقہ پر استعمال کرکے چھوڑ دے۔

کسی کے ذہن میں یہ آسکتا ہے کہ آزادی سے جنسی تعلقات کی اجازت ہونی چاہئے اور بچہ پیدا نہ ہوتا کہ عورت پر اس کی ذمہ داری عائد نہ ہوسکے تو اس کے لیے اول ہی سے مانعِ حمل ادویات کا استعمال کرلیا جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ایک دوسری اہم مشکل یہ پیش آئے گی کہ عورت ذات جس کی فطرت میں ماں کی ممتا اور ماں کی شفقت ودیعت کی گئی ہے وہ اپنے اس حق سے محروم ہوجائے گی، اور اگلی نسل پیدا نہ ہونے کی صورت میں معاشرے میں انسانی زندگی کے قافلہ کو دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا، جس سے سماج میں توازن بگڑ جائے گا، اور پوری قوم میں کبرسنی کا تناسب بڑھ جائے گا، جو معاشرہ کی اجتماعی اور اقتصادی حالت پر بری طرح اثر انداز ہوگا۔

غیر شرعی طریقوں پر جنسی تعلقات کے برے اثرات ونتائج میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

اس سے غیرت کے نام پر قتل کے واقعات میں اضافہ ہو جائے گا، کہ غیرت ایک ایسی انسانی فطرت ہے جو انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے، اور کوئی بھی غیرت مند فرد اس طرح کے غیر شرعی و غیر قانونی تعلقات کو اپنے گھر کی خواتین کے لیے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔

بہر حال اسلام نے جنسی تعلقات کے لیے جو اصول وضوابط متعین کیے ہیں اُن میں جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہیں یہ حکمت و مصلحت بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے عورت کے حقوق، اور معصوم و بے گناہ بچوں کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں، کہ آخر بچوں کو بھی جینے کا پورا حق ہے، نیز یہ کہ ان اصول وضوابط کی وجہ سے کوئی غیر ذمہ دار شخص بھی مشترکہ ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

شادی شدہ مرد یا عورت کی رجم وسنگ ساری کی سزا میں کیا حکمت ہے؟:

زنا کار مرد وعورت اگر شادی شدہ ہوں تو ان کو اسلامی شریعت میں سنگسار کرنے کا حکم ہے، اس سلسلہ میں بھی اعتراض کیا جاتا ہے، ہم یہاں پر اس اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں:

اولاً تو سنگساری کے مسئلہ میں اختلاف ہے، اہل علم کا ایک طبقہ تو اس کا قائل ہے کہ یہ حکم عہد نبوی سے آج تک باقی ہے اور اس کا ثبوت حضور اکرم ﷺ کے عمل سے ملتا ہے، چنانچہ ماعز نامی صحابی، غامدی قبیلہ کی خاتون، اور قبیلہ جہینہ کی خاتون، اور شراحہ نامی شخص وغیرہم مرد و عورتوں پر رجم کے قانون کو نافذ کیا گیا۔

اس کے علاوہ حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کر لیں تو اُن کی سزا یہ ہے کہ سو کوڑے مارے جائیں اور سنگسار کیا جائے۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ''رجم (سنگساری) کا حکم منسوخ نہیں ہوا، اگرچہ قرآن کریم سے اس کی قراءت منسوخ ہو چکی ہے۔''[2]

---

[1] صحيح مسلم : كتاب الحدود.

[2] دیکھئے: بخاری : كتاب الحدود.

دوسرا قول سنگساری کے بارے میں یہ ہے کہ آغازِ اسلام میں سنگساری کا حکم تخویف و ترہیب کے لیے تھا، اور چونکہ اس عہد میں یہ فعلِ شنیع عام تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں تخویف اور ترہیب اور ڈرانے کا پہلو اختیار کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، اس قول کے قائلین کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام نے زنا ثابت ہونے کے لیے گواہی کے جس ثبوت کو شرط ٹھیرایا ہے اس کا پایا جانا دشوار ہے، بلکہ اگر گواہ زنا کے ثبوت کو شروط کے مطابق پورا نہ کرسکیں تو اُن کو قانونِ اسلامی کے مطابق اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا بھگتنا ہوگی (سورۃ النور: آیۃ ۴)۔

نیز اگر تہمت لگانے والا شخص اپنی بیوی پر ہی تہمت لگا رہا ہے اور گواہ بھی پیش کررہا ہے تو اس کی بیوی کو لوگوں کے سامنے قسم کھا کر اپنی براءت ظاہر کرنا ہوگی۔

(سورۃ النور : ٦۔٩)

۲۔ وہ تمام حالات جن میں زانی یا زانیہ پر حد جاری کی گئی، رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی استثناء کے اس کی کوشش کی کہ حد جاری ہونے کا معاملہ ٹل جائے، مثلاً: ماعزؓ آئے اور انھوں نے زنا کا اعتراف کیا، تو آپ ﷺ نے اُن سے چار مرتبہ اعراض فرمایا، یا کئی دن آپ نے اُن سے صرفِ نظر کیا، اور پھر اُن کی قوم کے لوگوں سے ماعز رضی اللہ عنہ کی عقل اور ہوش وحواس کے بارے میں دریافت کیا، اور کوشش کی کہ کسی طرح یہ اعتراف سے باز آجائیں، بلکہ جب اُن پر رجم کی سزا کو جاری کیا جارہا تھا اور انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''کاش تم اُن کو بھاگنے دیتے (یعنی اُن کا پیچھا نہ کرتے)۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے چاہا کہ غامدی قبیلہ سے تعلق رکھنے والی عورت سے حد کا نفاذ ٹل جائے، اوراس کی آپ ﷺ نے بارہا کوشش کی۔ بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب بچہ کی رضاعت کی مدت پوری ہوجائے تب آنا، یعنی دوسال بعد۔'' [1]

[1] مسند احمد: باقی الانصار.

۳۔ زنا کا جرم کوئی ایک فرد نہیں کرسکتا بلکہ اس جرم میں دو فرد ملوث ہوتے ہیں، اور کسی روایت میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے طرف ثانی کو بھی سزا کا مستحق ٹھیرایا ہو، سوائے ایک شکل کے، وہ یہ کہ ایک شخص کی بیوی سے ایک غیر شادی شدہ شخص نے زنا کیا تو اُس زانی سے بیوی کے شوہر نے مالی عوض وصول کیا، اور یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ پر پیش ہوا تھا۔ [1]

۴۔ سورۂ نساء کی آیت نمبر (۱۵) میں زانی عورت کو قید کرنے کا حکم ہے، اس آیت کی قراءت باقی ہے اور اس کا حکم منسوخ ہے، جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ رجم کی آیت نہ صرف یہ کہ قراءۃ منسوخ ہے بلکہ حکماً بھی منسوخ ہے۔

۵۔ شریعت اسلامی میں ایسی بہت سے نصوص ہیں جن سے مقصود ڈرانا اور تخویف وترہیب ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالی کی رحمت سے دوری کی بددعا دینا، مثلاً: سود کھانے والے پر، یا ہاتھ گدوانے والی یا گودنے والی عورت وغیرہ وغیرہ پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

بہر حال اسلامی سزاؤں میں جو بھی غور وفکر کریگا بالخصوص زنا کی سزا میں، تو وہ یقیناً اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہے گا کہ یہ سزا اس لیے ہے تا کہ عام انسانی حقوق محفوظ رہے، چنانچہ اگر کوئی شخص سرِ راہ زنا کرتا ہے اور بآسانی چار گواہ بنظر غائر اس کو دیکھتے ہیں تو اس کا فعلِ بد نہ صرف یہ کے اس کے اقارب کی عزت ووقار پر حملہ ہے بلکہ اس کا کھلے عام یہ فعل بد کرنا عمومی اخلاق اور عمومی حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے دائرے میں بھی آتا ہے۔

شاید شادی شدہ زنا کرنے والے مرد اور عورت کی ''عقوبت'' یعنی سزا تنبیہ اور تخویف کا بہترین ذریعہ بنے (یعنی سزا کے ڈر سے معاشرہ میں جرائم رکتے ہیں) لیکن ساتھ ہی کسی جرم پر سزا جاری کرنے سے پہلے اس جرم کے ثبوت کے لیے سخت شروط بھی رکھی گئی ہیں، مثال کے طور پر زنا کو ثابت کرنے کے لیے بالخصوص شادی شدہ کے لیے زنا ثابت کرنے کے لیے ایسی شروط ہیں کہ اگر وہ پائی جائیں تب زنا ثابت ہوگا ورنہ نہیں۔ اور جو شخص اپنے زنا کا خود

[1] دیکھئے: بخاری: الصلح.

اعتراف کر لے اور اس کو بار بار مانے اور اپنے اوپر زنا کو ثابت کرے تاکہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو اس گناہ سے پاک کر کے آخرت میں جائے تو اس کو آخرت میں عظیم اجر ملے گا۔

چنانچہ اسلام میں سزاؤں کی ایک فائدہ دینی ودنیاوی یہ ہے کہ مجرم کے لیے سزا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں پاک ہونے کا وسیلہ ہے، اور اس کو سزا ملنے پر اجر وثواب عطا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے اُس خاتون کے بارے میں ارشاد فرمایا جو قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتی تھی، جس نے زنا کا اعتراف کیا اور پھر اس پر زنا کی حد جاری کی گئی: بلاشبہ اس خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کو اہلِ مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کیا جائے تو سب کو کافی ہو، اور کیا تم اس سے زیادہ فضیلت والا عمل پا سکتے ہو کہ اس نے اپنی جان کو اللہ پر قربان کر دیا۔ [1]

پھر اسلام پر ہی کیوں اعتراض کیا جاتا ہے کیا جمہوری نظام میں سخت سزائیں نہیں؟ جمہوری نظام میں بھی سخت سے سخت سزائیں ہیں، چنانچہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں یہ قانون ہے کہ اگر کسی نے کوڑے کرکٹ کو ہائی وے پر ڈال دیا تو اس پر پانچ سو ڈالر جرمانہ ہوگا، چاہے کوڑا کرکٹ کسی چیز کا خالی ڈبہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام میں سزائیں انسان کے اصلاح کے لیے ہیں جو انسانی نظریہ کے مطابق بھی ایسی ہیں کہ جرم کے مناسب ہیں، یعنی جیسا جرم ویسی ہی سزا۔

سزائیں ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے، اگر حقوق ضائع ہوں تو سزاؤں کے ذریعہ اُن کا کچھ بدل مل جاتا ہے، نیز یہ کہ صاحبِ حق اگر مجرم کے جرم کو معاف کرنا چاہے تو اسلام میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

کیا وہ شخص جو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے قتل کا مستحق ہوگا؟:

یہ بات گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام میں کسی پر کوئی زبردستی یا جبر نہیں اور اس کا مسلمہ قاعدہ واصول ہے کہ کسی کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے اس پر سختی نہیں کی جائے گی، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

[1] ترمذی: حدود.

﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾
''دین میں کوئی اکراہ یعنی زبردستی نہیں۔''

البتہ اگر کسی شخص نے برضا ورغبت اسلام قبول کرلیا تو اب اُس شخص نے گویا اللہ تعالی سے معاہدہ کرلیا جس کی رو سے وہ اب دنیاوی زندگی میں اُس معاہدہ کا پابند ہے،اوراسی وجہ اہل علم اُس حدیث شریف کا مطلب بیان کیا ہے جس میں ہے کہ'' جس شخص نے دین بدل دیا اس کو قتل کردو۔'' [1]

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی شخص نے کسی ملک سے اپنی نسبت جوڑ لی، یا بالفاظ دیگر کسی ملک کی شہریت حاصل کرلی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اُس ملک میں نافذ تمام قوانین کو تسلیم کرلیا جس میں بہت سی پابندیاں، سختیاں، ٹیکس کی ادائیگی قید وبند کی صعوبتیں اور پھانسی وغیرہ کا قانون بھی شامل ہے۔

عہد وپیمان یا معاہدہ ایسی چیز ہے جس کا پورا کرنا فریقین کے لیے لازم وضروری ہوتا ہے، اور طرفین میں سے کسی ایک فریق کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی جانب سے معاہدہ ختم کردے تاکہ اس معاہدے کے ساتھ جو لوگ بھی وابستہ ہیں ان سب کے حقوق کی پاسداری ہو۔لہٰذا عقد کرنے کی مطلق آزادی ہے لیکن اس عقد سے نکلنا طرفین کے حقوق کی پاسداری کے ساتھ مقید ومربوط ہے۔

یہاں ایک امر قابل غور ہے کہ جس وقت یہ حکم نازل ہوا (یعنی مرتد کے قتل کا حکم) اس وقت کا تاریخی پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے، لہٰذا ہم اُس وقت کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں:

عہد نبوی میں کسی کی ذاتی وسیاسی شناخت محفوظ رکھنے کے لیے ایسے وسائل نہ تھے جیسے آج مثلاً شناختی کارڈ یا پاسپورٹ وغیرہ ہیں، جن کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں مقام اور فلاں ملک کا رہنے والا ہے اور فلاں ملت سے اس کا تعلق ہے، چنانچہ

[1] بخاری: کتاب الجهاد.

مختلف علاقوں اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے ایک دوسرے کی تمیز ہوسکے اور ایک دوسرے کو پہچانا جاسکے، ہاں ایک تھوڑی بہت پہچان کی چیز تھی تو وہ دین و مذہب کی بنیاد تھی جس سے ایک دوسرے کو پہچانا جاسکتا تھا (اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مدینہ منورہ میں ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھی جس میں مختلف قوموں اور علاقوں وملکوں کے افراد شامل تھے، تاہم اس کی بھی ایسی مرتب ومنضبط شکل نہ تھی جیسی آج پائی جاتی ہے)

اُن حالات میں اسلام مخالف جماعت وافراد اور ان کے جاسوسوں کے لیے یہ بڑی آسانی تھی کہ جب چاہتے اسلامی تشخص اپنا لیتے اور جب چاہتے اسلام کا بھیس اتار دیتے اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچاتے، اس لیے اُن حالات میں اس اہم ترین نفاقی راستہ اور یقینی خطرہ پر بند لگانا از حد ضروری تھا تاکہ دشمنان اسلام اسلامی تشخص کو اپنی دسیسہ کاریوں اور مکاریوں کا آلہ بنا کر اسلام ومسلمانوں کو نقصان نہ پہنچاسکیں اس پس منظر میں مرتد کے قتل کا حکم نازل ہوا۔

واضح ہو کہ کسی جماعت کا تشخص اور اس کی پہچان ہی اس کو حقوق وواجبات فراہم کرتی ہے، چنانچہ اگر کسی جماعت یا مجموعہ کی اپنی کوئی شناخت نہ ہو تو جماعت یا مجموعہ سے غیر متعلق کوئی بھی فرد جماعت سے ملنے والی مراعات حاصل کرسکتا ہے، مثلاً: اگر کوئی ملک اپنے باشندوں کو شناختی کارڈ فراہم نہ کرے، تو بہت سے غیر ملکی بھی ملکی باشندوں کی طرح حقوق وسہولیات حاصل کرسکتے ہیں، اس لیے اسلام نے بھی دوسرے نظاموں کی طرح اپنے نظام سے تعرض کرنے یا کھلواڑ کرنے کی اجازت نہیں دی اور اپنے تشخص اور اسلامی پہچان کی حفاظت کی، اس کی مثال ہم یہاں قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دے سکتے ہیں کہ یہود کس طرح اسلامی تشخص سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾

(آل عمران: ۷۲)

''اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ دن کے شروع میں اُس کلام پر ایمان لے آؤ جو اہل ایمان پر نازل ہوا ہے اور دن کے آخر میں اس کا انکار کردو، شاید کہ (بہت سے مسلمان دین سے) واپس ہوجائیں۔''

چنانچہ یہود کی یہ شرارت رہتی تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بہانے مسلمانوں میں گھس کر اُن کو گمراہ کرتے اور اُن کے درمیان فتنے پیدا کرتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی شرارتوں کا پردہ فاش فرمادیا اور اُن پر اور اُن جیسے منافقوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے مرتد ہونے والے کے لیے قتل کی سزا تجویز کی گئی تا کہ یہ بھیس بدلنے والا خطرہ سرے سے ختم ہی ہوجائے۔

ایک اہم نکتہ:

اس کے ساتھ ساتھ یہ اہم نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اسلام چونکہ آسمانی مذاہب میں آخری مذہب ہے اور گویا تمام ادیان سماویہ کا آخری نسخہ ہے اس لیے کسی یہودی یا نصرانی کا اسلام قبول کرنا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اُس نے فطرت کے عین مطابق آخری مذہب اور دین حق کا آخری ایڈیشن اختیار کیا ہے جب کہ اس کے برعکس کسی مسلمان کا یہودیت یا نصرانیت اختیار کرنا گویا پیچھے کی جانب مڑنا ہے اور آخری دین کو چھوڑ کر پرانے دین سے چمٹے رہنا ہے اور یہ عین فطرت کے خلاف ہے۔

☆......جب کہ اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس حکم کی تطبیق وتنفیذ میں خود فقہاء اسلام کی آراء مختلف ہیں، بعض کا خیال ہے کہ اس حکم میں تخویف اور تہدید کا پہلو تطبیق وتنفیذ پر غالب ہے، اس قول کے قائلین کے دلائل میں سے ایک دلیل مرتد ہوجانے والی عورت کا مسئلہ ہے۔ [1]

اسی طرح فقہاء کے مابین اس بات پر تو اتفاق ہے کہ مرتد ہونے والے کو توبہ کی تلقین

[1] دیکھئے: ترمذی: کتاب الحدود.

کی جائے تاہم کتنی مدت تک اس کو توبہ کرنے کی مہلت دی جائے گی اس کی تحدید میں اختلاف ہے، چنانچہ بعض کا قول یہ ہے کہ ساری زندگی اس کو ارتداد سے توبہ کی مہلت دی جائے، اس لیے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ﴾ (البقرة : ۲۱۷)

''اور تم میں سے جو شخص بھی اپنے دین سے پھر جائے پھر کافر ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا وآخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((إنما الاعمال بخواتيمها .)) [1]

''اعمال کا دارومدار ان کے خاتمہ پر ہے۔''

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إن الله يقبل توبةالعبد مالم يغرغر)) [2]

''اللہ تعالی اپنے بندہ کی توبہ نزع کے وقت تک قبول فرماتے ہیں۔''

نیز ایک حدیث شریف میں آیا ہے:

''کسی مسلمان کا قتل جائز نہیں سوائے تین حالتوں کے: (جنمیں سے ایک) وہ شخص جو اسلام سے پھر جائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرے، ایسے شخص کو قتل کیا جائے گا، یا اس کو سولی دی جائے گی، یا اس کو ملک بدر کیا جائے گا۔'' [3]

---

[1] صحيح البخارى: كتاب الرقاق. [2] مسند احمد: سند المكثرين من الصحابة.

[3] سنن نسائی : تحريم الدم.

یعنی حدیث مذکور میں مترد کی سزا کو محاربۃ اللہ ورسولہ (یعنی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ) کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ صرف ارتداد پر قتل کا حکم نافذ نہیں ہوگا، بلکہ ارتداد کے بعد اگر مرتد اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے جنگ کرے گا تب ہی وہ اس سزا کا مستحق ہوگا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس رائے کے مالک فقہاء کی یہ دلیل بھی ہے کہ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ وہ لوگوں کی موت کے فیصلوں میں عجلت سے کام لے تا کہ ایک تو وہ اسلام لے آنے کے موقع سے محروم ہو جائیں دوسرے انہیں آخری عمر میں توبہ کی توفیق نہ ملے۔ ان فقہاء کا استدلال اس ارشادِ نبوی سے ہے:

''بے شک جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے اگر رب اس سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔''

یہ بات آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عرض کیا کہ ''اگر یہ عورت اس بات پر قادر ہوئی تو اپنے بچے کو کبھی آگ میں نہ پھینکے۔''

ان فقہاء کا استدلال اس بات سے بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس بات کے شدید حریص تھے کہ آپ ﷺ مشرکوں کی آنے والی نسلوں کو بھی اسلام لے آنے کا موقع عنایت فرمائیں۔ چنانچہ بنی ثقیف سے واپسی پر جب پہاڑوں کا فرشتہ حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اسے یہ جواب دیا کہ ''میں اُمید کرتا ہوں کہ رب تعالیٰ ان کی نسلوں سے وہ لوگ پیدا کر دے جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔'' یہ ارشاد آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا جب پہاڑوں کے فرشتے نے بنو ثقیف کو دو پہاڑوں کے درمیان کچل دینے کی اجازت مانگی تھی۔

خلاصہ

آج اسلامی تشریعات کو محدود وسائل کی حامل عقل پر اعتماد کر کے پرکھا جا رہا ہے حالانکہ قرآن وحدیث کی اصل منہج نقلی ہے نا کہ عقلی اور نصوص کی تفسیر ہے۔ البتہ عقل سے بھی مدد لی جاتی ہے اس لیے اسلام سے متعلق بعض ایسی حقیقتیں ہیں جن کا جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، تا کہ وہ اسلام کے عقائد اور اس کے احکام ومسائل پر بخوبی گفتگو کرنے کا اہل ہو سکے۔

۱۔ یہ جاننا چاہیے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اس کے اجزائے ترکیبی باہم مربوط ہیں جو ایسے اصول وقواعد پر مشتمل ہیں جس کے ذریعہ مخلوق کا اپنے خالق سے معاملہ درست ہوتا ہے، اور ان کے ذریعہ مخلوق کا آپس میں بھی ایک اچھا اور عمدہ تعلق وربط وجود میں آتا ہے، اسلامی نظریہ کے مطابق یہ زندگی صرف اور صرف آخرت کی کھیتی ہے اور آخرت کی تیاری کی جگہ ہے، جو کچھ ہم اس دنیا میں کرتے ہیں اگر چہ دنیا میں اس کا کچھ حصہ ہمیں ضرور ملتا ہے تاہم اصل حصہ اور حقیقی بدلہ تو آخرت ہی میں ملے گا، اور اسی کا اعتبار ہے، اسلام کے صریح ثابت شدہ احکام وتعلیمات پر اگر مسلمان کا عمل ناقص رہ گیا تو وہ آخرت میں سخت خسارہ میں رہے گا۔

۲۔ رب تعالیٰ کا علم ازلی ہے وہ ازل سے جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اس لیے اس کے لکھ لینے کا حکم دے دیا۔ پس اللہ کا علم مطلق ہے جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے اور محدود حواس سے ماورا ہے۔ یہی تقدیر ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ نے بندوں پر یہ حکم لاگو کر دیا ہے کہ وہ یہ کریں گے۔ اور جہاد یہ اسلام دشمنوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنانہ کارروائیوں کا ردّ عمل ہے نا کہ ان دوسروں کے ساتھ

جنگ ہے جو اسلام لے آنے سے انکار کرتے ہیں۔

۳۔ اسلام کے معنی ہیں کہ اپنی ذات کو اللہ تعالی وحدہ لا شریک لہ کے تابع فرمان بنا دینا اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی بھیجی ہوئی شریعت پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونا، اسلامی شریعت اولاً حضرت آدم علیہ السلام لے کر تشریف لائے، ان کے بعد سارے انبیاء ورسل (علیہم الصلاۃ والسلام) اپنے اپنے زمانوں اور اقوام میں شریعت الٰہی لاتے رہے اور اقوام وملل تک اس کو پہنچاتے رہے، اخیر میں سید الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری شریعت لے کر تشریف لائے، ساری دنیا کو اس سے روشناس کرایا اور ساری انسانیت کو اس کی طرف بلایا، بلکہ اس شریعت کو ساری انسانیت اور قیامت تک آنے والے ہر ہر فرد بشر تک پہنچانے کا حکم فرمایا، چنانچہ یہ آخری شریعت شریعت محمد ی قیامت تک کے لیے ہر زمان ومکان کے موزوں ومناسب قرار دی گئی ہے، لہٰذا اب مسلمانوں کو جائز نہیں کہ وہ اس عظیم الشان وعظیم القدر نعمت خداوندی یعنی شریعت الٰہی اور دین اسلامی کو صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھیں اور انسانیت کو اس سے محروم رکھیں، نہیں بلکہ اس امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے بلکہ یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ اس دین حنیف اور شریعت الٰہی کو سارے عالم میں پہنچائیں کہ اس پر عمل کرنے ہی میں ساری انسانیت بلکہ انسان وجنات کی دائمی وابدی سعادت مضمر ہے، البتہ اس شریعت کو زبردستی کسی پر تھوپنے اور کسی پر جبراً نافذ کرنے یا کرانے کا اختیار بھی کسی کو نہیں دیا گیا فرمادیا گیا ''لا اکراہ فی الدین''۔ دین میں جبر واکراہ نہیں۔

۴۔ اسلام میں انسانوں کے مختلف طبقات وفئات کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے چنانچہ کوئی طبقہ خواہ اکثریت میں ہو یا اقلیت میں اس کے حقوق اسلام میں متعین ومحفوظ ہیں، اور ہر چھوٹے بڑے طبقہ کو ایک ہی سیاسی وحدت ویونٹ میں شامل کیا گیا ہے، البتہ ہر طبقہ کو اس کے متوازن ومناسب حقوق فراہم کیے گئے ہیں مثلاً: اکثریتی طبقہ کو بعض وہ حقوق دیے گئے ہیں جو اقلیتی طبقہ کو نہیں دئے، تاہم انسان کے انفرادی حقوق مثل

عبادات یا عام شہری حقوق اقلیتی طبقہ کو دیئے گئے ہیں جن کو اکثریت کے بنائے ہوئے عمومی قوانین اور اصول ومبادی کی روشنی میں طے کیا جاتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالی نے انسانوں میں باہمی تعاون کا جذبہ اور باہمی معاونت کی صفت ودیعت فرمائی ہے، بلکہ اس فطرت کے ساتھ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے تاکہ انسان دنیا وآخرت میں سرخروسعادت مند ہو سکے، اور اس سلسلہ میں اسلام کی ایسی روشن تعلیمات ہیں کہ اگر کوئی محروم انسان باہمی تعاون کا منکر ہو اور ابدی سعادت سے صرف نظر کرے، اسلام سے دور رہے اور اس کو دین کے طور پر اختیار نہ کرے تب بھی اسلام نے ان محروموں کے ساتھ تعاون کرنے کی اور ان سے حسن سلوک وروا داری کی تلقین کی ہے تاکہ کم ازکم یہ لوگ دنیا ہی میں غیروں سے راحت اٹھالیں، اس لیے اسلام اس کی ترغیب دیتا ہے کہ باہمی معاملات اور مشترکہ امور میں امداد باہمی کے جذبہ خیر کو فروغ دیا جائے۔

٦۔ عصر حاضر میں اسلام پر دہشت گردی کے الزامات کی خوب تشہیر کی جارہی ہے اور بہت سے اسلامی امور کو دہشت گردی کے زمرہ میں لایا جارہا ہے، لیکن اسلام نے دہشت گردی کی بنیادی تعریف بیان کر دی ہے اور اس کے معنی ومفہوم کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے، اور صراحت کی ہے کہ دہشت گردی کیا ہے اس کے حدود اربعہ کیا ہیں، کون سی دہشت گردی ظلم کے دائرہ میں آتی ہے اور کونسی دہشت گردی وہ ہے جو دفاعی ضرورت کے تحت نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ہر صاحب عقل کے نزدیک وہ ضروری ہے، آئندہ سطور میں دہشت گردی سے متعلق وضاحت پیش کی جاتی ہے:

☆......اسلام میں دہشت کے معنی کے لیے دو کلمے وارد ہوئے ہیں:

(۱)......ارہاب جس کا ترجمہ انگریزی میں terrorism ہے۔

(۲)...... " رعب " ان دونوں کے معانی ومفہوم سمجھنے کے لیے درج ذیل وضاحت ضروری ہے:

۱۔ ''ارہاب'' یا ''ارعاب'' یعنی دہشت ورعب پیدا کرنا اگر ظالمانہ ہوتو اس کو اسلام میں بالکل حرام قرار دیا گیا ہے اوراس کے لیے سخت سزائیں مقرر کی گئیں ہیں، اس ضمن میں ہر وہ ''ارہابی کارروائی'' یا کہیے'' دہشت گردی'' آتی ہے جس میں دوسروں کو بے گناہ نشانہ بنایا جائے، یا کوئی فرد و جماعت دوسروں کو بلاوجہ دہشت زدہ کرے، یا کسی ایسے شخص کا تعاون کرے جو دہشت پھیلا رہا ہو، نیز اس زمرہ میں وہ فرد یا جماعت بھی آتی ہے جو کسی سے لڑائی میں مشغول ہو اور اس کو منصفانہ حل پر آمادہ کیا جائے مگر وہ اس کو قبول نہ کرے تو گویا یہ فرد و جماعت دہشت گردی کی مرتکب ہے۔

۲۔ ایک دہشت گردی یا تخویف وتہدید پھیلانا وہ ہے جو دشمن سے بچاؤ اور دفاع کے طور پر ہوتی ہے، مثلاً کوئی مظلوم یا جس پر زیادتی ہورہی ہو وہ اپنے ظالم کے خلاف خوف ودہشت اور تخویف وترعیب کا حربہ استعال کرتا ہے اُس کو ڈرانے کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ مظلوم کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے، البتہ اسلام نے اس دہشت وتخویف کی اجازت بقدر ضرورت اور مخصوص شرائط کے ساتھ دی ہے، یعنی مظلوم صرف اپنے دفاع کے لیے ایسا کرسکتا ہے تاکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم سے نجات حاصل کرسکے۔

ہم اگر اقوام متحدہ کے احوال پر یا اس کی قراردادوں اور قوانین پر نظر ڈالیں تو وہ بھی اس معاملہ میں اسلام کے ساتھ متفق نظر آتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی دہشت گردی اور ترویع وتخویف اختیار کرنا یہ وقت کا تقاضا ہوتا ہے اور قوم یا افراد کو اپنے دفاع کے طور پر اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس دنیا میں خیر وشر کے مابین جنگ ازل سے چلی آرہی ہے، آج کی دنیا میں ظلم اپنی متعدد شکلوں سے وجود میں آرہا ہے مثلاً: دشمن بغیر اسلحہ کے بھی ظلم کرتا ہے اور ظالم کا ساتھ دیتا ہے، جیسے ووٹنگ کے ذریعہ ظالم کا ساتھ دینا، یا مظلوم کے خلاف ویٹو کرنا، یا اقتصادی پابندی لگانا، یا کسی ملک وقوم کے درمیان داخلی فتنے پیدا کرنا، کسی مذہب یا تہذیب کو مجروح کرنا اور کسی قوم یا ملک پر اپنی تہذیب وکلچر مسلط کرنا، یا لوگوں

کے افکار وسوچ کو میڈیا کے ذریعہ خراب کرنا یا ظالم کا اپنی طرف مائل کرنا، کسی ملک یا مذہب کی اچھی تہذیب کو بگاڑنا، اور یہ وہ شرارتیں یا عداوتیں ہیں جن کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں اور اس میں نشانہ فرد واحد یا چند افراد نہیں ہوتے بلکہ ملک کے ملک اور قوم کی قوم متاثر ہوتی ہے اور بے موت مرجاتی ہے، اس طرح کی دہشت گردی اس زمانے میں بہت عام ہورہی ہے اور مذاہب واقوام کا تشخص داؤ پر لگا ہوا ہے۔

بعض لوگ جب بعض اسلام کے ثابت شدہ احکام پر اعتراض کرتے ہیں تو وہ دو باتیں بھول جاتے ہیں:

ا۔ ایک یہ کہ ایک مسلمان کو جب یہ معلوم ہوجائے کہ اس عمل کا حکم اللہ تعالی کی طرف سے ہے تو وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ حکم دنیا میں پائے جانے والے اس قبیل کے کسی بھی عمل سے جس تک کسی انسان کی رسائی ہوئی ہو افضل واعلی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالی ہی انسانوں کے خالق وپیدا کرنے والے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ بندوں کے لیے کیا صالح ومفید ہے اور کیا غیر مفید، واضح ہو کہ مغربی نشاۃ ثانیہ اور اس کی موجودہ سائینس وٹیکنالوجی اور تحقیق وتدقیق کے دور میں بعض انسانی تجربات اور تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اسلام کے اکثر اعمال واحکام دنیا میں پائے جانے والے دوسرے اس قبیل کے اعمال واحکام کہ بہ نسبت زیادہ متوازن ومناسب اور انسانی حقوق کے زیادہ پاسدار ہیں اور اس میں انسان کی رعایت کا پہلو زیادہ ہے۔

۲۔ دوسری اہم حقیقت جس سے بہت سے اسلام پر اعتراض کرنے والے لوگ یا غافل ہیں یا چشم پوشی سے کام لیتے ہیں وہ یہ کہ انسانی علم خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو آخر ناقص ہی ہے، اس کی معرفت اور دانائی کا دائرہ محدود ہے، اس کے علم کے وسائل محدود ہیں، انسان کو یہ زیبا نہیں دیتا کہ وہ اللہ تعالی کے بتائے ہوئے احکام واعمال میں تنقید کرے یا اللہ تعالی کی بھیجی ہوئی شریعت کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنائے کہ اللہ رب العزت ہی سب کے خالق ومالک ہیں۔

ہاں ایک انسان کو اللہ تعالی نے جو فطرت سلیمہ عطا کی ہے، یا جو صحیح علم ومعرفت اس نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں وہ بعض اسلامی تشریعات کے حکم واسرار اور اس کی باریکیوں کو معلوم کرسکتا ہے، لیکن کوئی علم کے خواہ کسی بھی درجہ پر پہنچ جائے یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ وہ ربانی تشریع اور احکام اسلامی کے تمام اسرار وحکمتوں کو بدرجہ اتم جانتا ہے یا جاننے پر قادر ہے۔

اسلام کے احکام اور اس کے عطا کردہ حقوق دوسرے ایسے حقوق پر فضیلت اور فوقیت رکھتے ہیں جو انسانوں نے اپنے اجتہادات سے بنائے یا متعین کیے ہیں، اس کی ایک واضح مثال ہمارے سامنے وہ حقوق ہیں جو عورت سے متعلق ہیں: چنانچہ اگر ہم اسلام نے عورت کو جو حقوق دئے ہیں اُن کا موازنہ اُن حقوق سے کریں جو انسانی اجتہادات کی روشنی میں اس کو ملے ہیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اسلامی حقوق کتنے صاف شفاف اور حقیقت وانصاف پر مبنی ہیں، اسلام نے عورت کو جو حقوق اور معاشرہ میں جو مرتبہ ومقام اس کو چودہ سو سال پہلے دیا تھا، انسانی خودساختہ قوانین نے اُن میں سے بہت سے حقوق ابھی پچھلی صدی میں عورت کے لیے ثابت ومتعین کیے ہیں، جب کہ ابھی بھی بہت سے ایسے حقوق ہیں جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں مگر دنیا کے قانون سازوں نے آج تک بھی عورت کو اُن سے محروم کیا ہوا ہے مثال کے طور پر اسلام نے عورت کو خاندان کو چلانے یا اس کی مالی ذمہ داری پوری کرنے سے مستثنی کیا ہے اور گھر کی مالی ذمہ داری اور گھریلو اخراجات مرد کے ذمہ عائد کیے ہیں، مگر دنیا کے دوسرے قوانین نے اور عورت کے حقوق کا نعرہ بلند کرنے والوں نے آج تک بھی عورت کو خاندان کی مالی ذمہ داریوں سے عہد برآ نہیں کیا ہے۔

بہت سے لوگ ایسی اسلامی حکومتوں کو طعن وتنقید کا نشانہ بناتے ہیں جن میں شریعت کا نفاذ اور اس کی حدود وتعزیرات نافذ ہیں، جب کہ وہ بعض ایسی حقیقتیں فراموش کردیتے ہیں جن کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ جب کسی قوم یا قوم کی اکثریت نے اپنے ملک میں ایک متعینہ قوانین اور دستور کو اپنے مسائل کے حل کرنے کے لیے تسلیم کرلیا تو یہ اُن کا حق ہے جس کو جمہوریت اور سیکرلرزم

کے دعویدار بھی تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ اقوام متحدہ کا دستور اور اس کے قوانین اور اس کے بین الاقوامی معاہدوں کی رو سے ہر قوم کو یہ آزادی اور حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو دستور چاہئے چنے اور جس قانون کو اپنے لیے اختیار کرنا چاہے اختیار کرے، چنانچہ اگر کسی قوم نے اسلام کو یا کسی دوسرے دستور کو اپنے لیے اختیار کیا ہے تو اب اُس دستور پر یا اس دستور پر عمل کرنے والی قوم پر یا اُس دستور کو نافذ کرنے والی حکومت کو نشانہ بنانا اور اعتراض کرنا یہ اقوام متحدہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔

۳۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کوئی قوم یا اس کی اکثریت کسی نظام کو اپنے لیے اختیار کرے (جس کو وہ اپنے لیے درست سمجھتی ہو خواہ وہ نظام دوسروں کی نظر میں درست نہ ہو) اور وہاں کی حکومت اُس نظام اور دستور کو عادلانہ ومنصفانہ طریقہ پر نافذ نہ کرے، یا اقلیات پر ایسے قوانین نافذ کرے جو ملکی قوانین سے متصادم ہوں دونوں میں فرق ہے، کسی حکومت کا فعل اس بات کی دلیل نہیں کہ اُس ملک کا قانون غلط ہے، لہٰذا اگر کوئی اسلامی حکومت ایسے قوانین بناتی ہے یا نافذ کرتی ہے جو اسلام کی روح اور اس کے دستور کے منافی ہو تو اس سے اسلام کے نظام اور اس کے دستور پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

۴۔ اگر ہر انسان پہلے اپنی ذات کا جائزہ لے پھر اسلامی احکام واعمال کو عصر حاضر کی روشنی میں دیکھے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی اعمال واحکام انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کے عین موافق ہیں۔

آخر میں اس بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ شدت پسندی کا لفظ نسبتی ہے جو مختلف معاشروں اور مختلف زمانوں میں ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کا صحیح مدلول وہی ہے جو اغلبیت کے اختیار کردہ قانونِ تشریع کے ماتحت ہو۔ اگر ہم اپنے معیارات کو ایک طرف رکھ کر خالص اسلامی تعلیمات کو واقعاتی حقائق کے تناظر میں دیکھیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت روشن ہو کر آئے گی کہ اسلامی تعلیمات وتشریعات سراسر فطری ہیں بلکہ ممتاز ہیں نا کہ

اجنبی جیسا کہ اوّل وہلہ میں محسوس ہوتا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیماتِ ربانیہ جن و انس کے لیے زیادہ مفید و مستحکم ہیں جب کہ انہیں قرار واقعی طور پر معاشرے میں نافذ کر دیا جائے۔ تعلیمات ربانیہ فرد و معاشرے کے حقوق میں اور اقلیت اور اکثریت کے حقوق میں موازنہ کرنے کی اور دنیاوی و اخروی مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت زیادہ رکھتی ہیں۔

یادداشت